ہند سے یونان تک
محی الدین نواب

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں اور فتوحات کی مستند تاریخ سے پہلے ہندو راجاؤں مہاراجاؤں کی مسلسل تاریخ نہیں لکھی گئی۔ رامائن اور مہابھارت جیسے اہم واقعات کس زمانے میں ہوئے؟ اس کے بعد بھی راج گھرانے کس ترتیب سے حکومت کرتے رہے؟ ان کے ماہ وسال کا حساب اس قدیم زمانے میں نہیں کیا گیا۔

دھارمک کہانیوں سے، پُرانوں سے، پتھروں اور غاروں میں بنائی ہوئی تصویروں سے اور آثار قدیمہ سے قدیم ہندوستان کے جو حالات اور واقعات سامنے آئے، ان کے مطابق مگدھ کی سلطنت بنارس اور گیا کے علاقوں میں قائم تھی۔ اس دور میں شیش ناگ راج خاندان کا نام آتا ہے۔

اسی شیش ناگ خاندان سے بمب سار نامی ایک راجہ کے مختصر سے حالات تاریخ میں ملتے ہیں۔ وہ بہت ہی معاملہ فہم اور امن پسند تھا۔ لشکری قوت رکھنے کے باوجود جنگ لڑنے سے گریز کرتا تھا۔ کہتا تھا' میدانِ جنگ میں دونوں طرف کے ہزاروں سپاہی صرف اس لئے مارے جاتے ہیں کہ دو راجہ اپنے اقتدار کو وسیع اور مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا صلح جوئی سے بھی ہوسکتا ہے۔

وہ آس پاس کے راجاؤں کو دوستی اور خیر سگالی کے پیغام بھیجتا تھا۔ دوستی ہونے کے بعد رشتے داری کرتا تھا۔ ان راجاؤں کی بہنوں اور بیٹیوں سے شادی کرتا تھا اور اپنی بہنوں اور راج گھرانے کی کنواریوں کو ان راجاؤں سے بیاہ دیتا تھا۔

ایسی حکمت عملی کے باعث اس کے عہد میں کبھی جنگ نہیں ہوئی۔ کبھی کوئی سپاہی

مارا نہیں گیا۔ بمب سار نے کئی شادیاں کیں۔ لیکن وشالی خاندان کی جس راجکماری سے شادی کی وہ قابلِ ذکر ہے۔

اس راجکماری نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ جس کا نام اجات شترو رکھا گیا۔ بمب سار اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو اس نے راج دربار میں اعلان کیا۔ ''میرا یہ بیٹا راج گدی کا وارث ہے۔ میرے بعد یہ راج پاٹ سنبھالے گا۔''

بیٹا باپ جیسا معاملہ فہم اور امن پسند نہیں تھا۔ آس پاس کے راجاؤں کی دوستی نہیں ان کا تاج و تخت زیادہ تھا۔ اس نے راج ماتا سے پوچھا۔ ''کیا میں پتا جی کے تخت پر بیٹھ کر صرف راجہ ہی کہلاؤں گا؟''

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں پڑوسی راجاؤں کو زیر کر کے ان کے علاقوں میں بھی حکومت قائم کروں گا تو مہاراجہ کہلاؤں گا۔ بس میں یہی چاہتا ہوں۔''

''میں مانتی ہوں ہر راجہ کا یہی سپنا ہوتا ہے مگر سوامی بمب سار کی زندگی میں تیرا یہ سپنا پورا نہیں ہوگا۔''

وہ ماں سے دور ہو کر زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ ''پتا جی کو موت آئے گی تو میرے سپنوں کو زندگی ملے گی۔ پتہ نہیں، ان کی سانسیں کب پوری ہوں گی؟''

اس کے تیور صرف اس لئے بگڑتے تھے کہ راجہ سے مہاراجہ بن نہیں پا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بھی مزاج بدل جاتا تھا کہ وہ محل میں داسیوں کو عیاشی کے لئے نہیں صرف کام کاج کے لئے رکھتا تھا۔ اجات شترو اپنے ماموں کے پاس آ کر شکایت کرتا تھا۔ ''ماما! میں کیا کروں؟ میرے محل میں ایک بھی داسی کو آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کیا میں کنوارا ہی مر جاؤں گا؟''

ماما ہنستا تھا۔ پھر اس کے شانے کو تھپک کر کہتا تھا۔ ''صبر کر بھانجے! کل وہ بوڑھا ہو گا تو تیری جوانی خود ہی ہولی دیوالی منائے گی۔ تُو اپنے محل میں درجنوں داسیاں رکھے گا۔ دارو پیئے گا۔ تیرا بوڑھا اور بیمار باپ تجھے روکنے نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس وقت تُو



یہاں کا راجہ ہوگا۔''

ماما اس کا رازدار تھا۔ اپنے بہنوئی راجہ سے چھپا کر اس کے لئے دارو کا مٹکا لے آتا تھا۔ کسی چھیل چھبیلی کو بھی پکڑ لاتا تھا۔ پھر صبح ہونے تک بھانجے کی جھوٹی دارو اور جھوٹی لُگائی سے موج مستی کر لیا کرتا تھا۔

بمب سار نادان نہیں تھا۔ بیٹے پر کڑی نظر رکھتا تھا مگر نیند کا متوالا تھا۔ راتوں کو اس سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ پھر بھی محل کے مخبر نے اس کے کانوں میں یہ بات پھونک دی کہ اس کا سالا راجکمار کو گمراہ کر رہا ہے۔

اس نے سالے کو بلا کر گالیاں دیں۔ اس کی پٹائی کی۔ پھر اسے محل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ جوان بیٹے کی ضرورتوں کو نہیں سمجھ رہا۔ اگر اس کی ضرورت پوری نہیں کرے گا تو بیٹا چور راستے سے یہ سب کچھ کرتا رہے گا۔ آخر وہ بیٹے کا دل بہلانے کے لئے ایک چاندسی بہو محل میں لے آیا۔

ماما لات جوتے کھا کر تکلیف سے کراہتے ہوئے محل سے باہر گیا تھا۔ بہو چھم چھم کرتی بیٹے کی خوابگاہ میں آ گئی۔ وہ ماما سے دو ہاتھ آگے نکلی۔ اسے رانی مہارانی بننے کا شوق تھا۔ اس نے پہلی رات اجات شترو کی گردن میں بانہیں ڈال کر اپنے بدن کی آنچ پہنچاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم راجہ کب بنو گے...؟ میں رانی کب بنوں گی؟''

انسانی رشتے بہت ہی ناپائیدار ہوتے ہیں۔ ماں باپ بڑے ارمانوں سے اولاد پیدا کرتے ہیں۔ اس کی پیدائش پر خوب جشن مناتے ہیں۔ وہی اولاد جوان ہو کر جلد سے جلد زمین جائیداد حاصل کرنے کے لئے سوچتی ہے کہ بڈھے کب مریں گے؟

بہو رانی نے یہ نہیں کہا کہ سسر جی کی موت کے بعد ہی سپنے پورے ہوں گے۔ وہ دن رات یہی کہتی تھی۔ ''مجھے رانی بنا دو۔ مجھے تمہارے ساتھ راج سنگھاسن پر بیٹھنے کی آرزو ہے۔ بس اتنی سی آرزو پوری کر دو۔''

اجات شترو نے خود ہی کہا۔ ''پتا جی کا دہانت ہوگا، تب ہی ہم راج سنگھاسن پر بیٹھ پائیں گے مگر ان کی صحت دیکھ کر لگتا ہے، وہ میرے بعد ہی مریں گے۔''

بیوی نے کہا۔ ’’تمہاری سوتیلی ماں تمہارے پتا جی کو اپنا دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو راج گدی پر بٹھانا چاہتی ہے۔ عورتوں کی مکاریوں کو تم نہیں سمجھتے۔ وہ سسر جی کا دھیان تمہاری طرف سے ہٹائے گی تو تمہارا سوتیلا بھائی اچانک گدی پر بیٹھ جائے گا اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔‘‘

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ’’سمجھ میں نہیں آتا‘ کیا کروں؟ پتا جی کو مرنا چاہئے۔ کسی بھی طرح مرنا چاہئے۔‘‘

ایک بار وہ شکار کھیلنے باپ اور سوتیلے بھائی کے ساتھ جنگل میں گیا۔ اجات شترو نے شکار کھلانے والے کو بھاری رشوت دی تا کہ شیر کے ساتھ راجہ کا بھی شکار ہو جائے۔ جس وقت جنگل میں ایک شیر کو چاروں طرف سے گھیر کر راجہ تک لانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں، ایسے وقت افراتفری میں کہیں سے آنے والے ایک تیر نے سوتیلے بھائی کا کام تمام کر دیا۔

وہ چاہتا تھا کہ باپ سے نجات ملے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ سوتیلے بھائی سے نجات مل گئی تھی۔ اب دوسرا کوئی راج گدی کا دعویدار نہیں رہا تھا۔ بیوی نے کہا۔ ’’اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی راج سنگھاسن ہم سے دور رہے گا۔‘‘

اس نے کہا۔ ’’میں کیا کروں؟ پتا جی نے تو کبھی نہ مرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ سوتیلا بھائی تیر سے مارا گیا۔ آئندہ پتا جی کو تیر اور تلوار سے مارا جائے گا تو سب ہی مجھ پر چھی چھی تھو تھو کریں گے کہ میں نے راجہ بننے کے لئے باپ کی ہتیا کی ہے۔‘‘

بیوی نے کہا۔ ’’ایسا تو راج گھرانوں میں ہوتا ہی ہے۔ بھائی بھائی کو اور بیٹا باپ کو قتل کر کے راجہ بنتا ہے۔‘‘

’’مگر میں ساری زندگی کے لئے یہ بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔ کسی طرح چپ چاپ رازداری سے ان کی موت ہو جائے تو اچھا ہے۔‘‘

’’مجھے کچھ دنوں کے لئے اپنے میکے میں جا کر رہنے دو۔ وہاں سے ایک دوا لاؤں گی۔ وہ دوا سسر جی کو دھیرے دھیرے کمزور بنا کر مار ڈالے گی۔‘‘



’’آخر وہ کیسی دوا ہے... کچھ معلوم تو ہو؟‘‘

’’اگر ہم سسر جی کے کھانے پینے کی چیزوں میں اس دوا کا ایک قطرہ روز ڈالتے رہیں گے تو ان کی بھوک مر جائے گی۔ وہ کچھ کھائے پیئے بغیر کمزور پڑتے رہیں گے۔ زبردستی کچھ کھانا چاہیں گے تو قے ہو جایا کرے گی۔‘‘

اجات شترو نے کہا۔ ’’ہمارے راج گھرانے کے وید ان کا علاج کریں گے۔‘‘

’’کوئی وید تو کیا‘ کوئی تانترک مہاراج بھی ان کی بیماری کو سمجھ نہیں پائے گا، جب بیماری سمجھ میں نہیں آئے گی تو علاج بھی نہیں ہو سکے گا۔‘‘

بہو رانی اپنی ساس اور سسر سے اجازت لے کر میکے چلی گئی۔ بمب سار نے کوشل کے ایک راجہ کی بیٹی کو اپنی دھرم پتنی بنایا تھا۔ اس کا نام کوشلیا تھا۔ کوشلیا کا بیٹا شکار کھیلنے کے دوران مارا گیا تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ تیر کہاں سے آیا تھا اور کس نے چلایا تھا؟

کوشلیا نے بمب سار سے کہا۔ ’’تم مانو یا نہ مانو‘ تمہارے چہیتے بیٹے اجات شترو نے ہی میرے بیٹے کو ہلاک کرایا ہے۔‘‘

واقعی بمب سار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ’’شکار کھیلتے سمے اجات شترو میرے ساتھ ہاتھی پر تھا۔ اس نے اپنے بھائی پر تیر نہیں چلایا ہے۔ وہ تیر کسی دوسری طرف سے آیا تھا۔ ایک سوتیلی ماں کی زبان سے اجات شترو پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔‘‘

کوشلیا کسی ثبوت کے بغیر اجات شترو کو اپنے بیٹے ہتیارا ثابت نہ کر سکی۔ ادھر بہو رانی میکے سے واپس آ گئی۔ ساتھ ہی ایک بڑی سے بوتل میں دوا لے آئی۔ اب وہ روز سسر کو کھانا پروسنے سے پہلے رسوئی گھر میں جاتی تھی اور اس کے کھانے پینے کی کسی بھی چیز میں دوا کا ایک قطرہ ٹپکا دیتی تھی۔

دو چار روز میں ہی نتیجہ ظاہر ہونے لگا۔ راجہ بمب سار کی خوراک کم ہونے لگی۔ زیادہ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ راج وید اسے بھوک لگنے کی دوائیں دیتے تھے۔ پھر بھی اسے بھوک نہیں لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا پہلوانوں جیسا جسم گھلنے اور سکڑنے لگا۔ وہ گوشت کا پہاڑ تھا‘ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا چلا گیا۔

تاریخی کتابوں میں یہ درج ہے کہ وہ باپ کو بھوکا رکھتا تھا۔اسے کھانے کو نہیں دیتا تھا۔لیکن کس طرح اسے بھوکا رکھتا تھا اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔اجات شترو کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس پر باپ کے قتل کا الزام نہ آئے۔اگر وہ اپنے پتا جی کو قیدی بنا کر بھوکا رکھ کر مارتا تو اس کی سنگدلی کسی سے نہ چھپتی۔پھر اپنے ہاتھوں سے مارنا ہی ہوتا تو وہ کئی دن تک اسے فاقے سے نہ کرواتا۔تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیتا۔

اس کی بیوی نے بھرپور تعاون کیا۔اس نے بڑی رازداری سے باپ کو ہلاک کر دیا۔اس کی سوتیلی ماں کوشلیا راج محل چھوڑ کر اپنے باپ کوشل کے راجہ کے پاس آ گئی۔وہاں اس نے کھل کر الزام لگایا کہ اجات شترو نے بڑی مکاری سے باپ کو بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالا ہے۔

مہاتما بدھ کے چچا زاد بھائی کا نام دیودت تھا۔وہ بدھ کی تعلیمات اور اس کی عظمت کا منکر تھا۔ایسا شر پسند تھا کہ اس نے بدھ کے مقابلے میں اپنے طور پر ایک دھرم کا پرچار کیا تھا۔پھر عارضی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد ناکام رہا تھا۔بمب سار کو ہلاک کرنے کے بارے میں یہ حکایت ہے کہ دیودت نے ہی اجات شترو کو باپ کے قتل پر اکسایا تھا۔

ویسے اجات شترو اپنی ذات میں خود ہی درندہ تھا۔تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے سوتیلی ماں کوشلیا کے باپ سے جنگ کی۔آس پاس کے راجہ ہمیشہ کی طرح امن و امان سے رہنا چاہتے تھے۔لیکن ملک گیری کی ہوس نے اجات شترو کو جنگجو راجہ بنا دیا۔اس نے کوشل کے راجہ کو شکست دی تو اس کے حوصلے بڑھ گئے۔پھر وہ دوسرے راجاؤں کو بھی زیر کرنے لگا۔ایک عرصے تک قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھنے کے باوجود اس نے ثابت نہ ہونے دیا کہ اپنے باپ کا قاتل ہے۔مہاتما بدھ کے آخری ایام میں جانے اس میں کیسے تبدیلیاں آئیں کہ وہ بدھ مذہب کی طرف مائل ہو گیا۔بدھ مذہب کی ایک کتاب میں یہ درج ہے کہ وہ مہاتما کے پاس آیا



تھا۔اس کے روبرو بیٹھ کر اس نے کہا۔''میں ایک پاپی ہتیارا ہوں۔''

مہاتما دھیان گیان میں ڈوبے ہوئے تھے۔انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔وہ اپنی راون کہانی سنانے لگا۔ملک گیری کی ہوس، جنگ و جدل اور فتوحات کے بارے میں بہت کچھ کہنے کے بعد بولا۔''میں نے جو چاہا، وہ حاصل کیا۔اپنے تمام ارمان پورے کئے۔پھر بھی میری آتما بے چین رہتی ہے۔مجھے من کی شانتی نہیں مل رہی ہے۔''

مہاتما نے کہا۔''اپنے من کو ٹٹولو۔کوئی پھانس چبھی ہوئی ہے۔''

''آپ سچ کہتے ہیں، ایک پھانس ہے، جسے میں دنیا والوں کے سامنے نکال نہیں پاتا۔''

''اسے نکالو، تب ہی شانتی ملے گی۔''

''کیا گناہ کا اعتراف کرنے سے مجھے آرام آئے گا؟''

''صرف گناہ کا اعتراف کرنے سے بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔پرنتو من کو شانتی تب ہی ملے گی، جب تم گناہوں سے توبہ کرو گے، پاپ کو چھوڑ کر پُن کماؤ گے۔''

''میں پاپ کا راستہ چھوڑ کر پُن کمانے کے لئے آپ کے چرنوں میں آیا ہوں۔آپ گری ہوئی چیز کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھتے ہیں۔اندھیرے میں دیا جلاتے ہیں تو آنکھ والوں کو راستہ دکھائی دیتا ہے۔''

پھر اس نے مہاتما کے چرنوں کو چھو کر کہا۔''میں اعتراف کرتا ہوں تخت و تاج کی اور ملک گیری کی ہوس نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔میں راجاؤں سے بھی زیادہ مہاراجہ بننا چاہتا تھا۔میں نے اس ہوس میں اپنے پتا جی کو بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالا۔''

مہاتما نے کہا۔''بے شک۔تم پر ہوس غالب آ گئی تھی۔مگر تم اپنے کئے پر پچھتا رہے ہو۔اپنے جرم کا اقرار کر رہے ہو اور سچے دل سے توبہ کر رہے ہو۔''

مہاتما نے آشرواد دینے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔''میں جان گیا ہوں اب تمہارے اندر کوئی کھوٹ کپٹ نہیں ہے۔تم نے سچے دل سے توبہ کی ہے۔جاؤ... آج

سے تمہیں من کی شانتی ملے گی۔"

اجات شترو دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ مذہبی کتابوں میں اور عبادت گاہوں کی دیواروں پر ان کی ہسٹری بیان کرنے کے لئے جو تصویریں کندا کی گئی ہیں ان میں سے ایک تصویر میں بدھ اور اجات شترو کی ملاقات کا منظر دکھایا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے من کی شانتی کے لئے مہاتما کے پاس نہ جاتا تو یہ بھید کبھی نہ کھلتا کہ اس نے باپ کو کس طرح بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالا تھا۔

کچھ عرصے بعد اس کے بھی دن پورے ہو گئے۔ اس کے بیٹے کا نام درسک تھا۔ درسک کے بیٹے کا نام اُودیا تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ ان کے دور حکومت میں قابل ذکر واقعات پیش نہیں آئے۔ اسی لئے تاریخ میں ان کا ذکر بہت اختصار سے کیا گیا ہے۔

اس خاندان کا آخری راجہ مہانندن تھا۔ اگرچہ اس کے بعد اس کے بیٹے نے حکومت کی۔ لیکن مہانندن کو آخری راجہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد شیش ناگ خاندان کا نام نہ رہا۔ اس کے بیٹے مہاپدم نند نے اپنے طور پر نند خاندان کی بنیاد ڈالی تھی۔

اس خاندان میں تبدیلی کی وجہ یہ بھی تھی کہ آخری راجہ مہانندن ایک نیچ ذات کی عورت پر عاشق ہو گیا تھا۔ اسے اپنی تمام رانیوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ لیکن اسے رانی کا درجہ نہیں دے سکتا تھا۔ راج گھرانے کی معزز رانیاں اس کے ساتھ محل میں رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس سے بات تک کرنا گوارہ نہیں کرتی تھیں۔ اپنے نفرت بھرے روّیوں سے یہ جتاتی رہتی تھیں کہ وہ ایک نیچ ذات کی ہے، ہمیشہ نیچ ہی رہے گی۔

اس کا نام چمیلی تھا۔ بلا کی خوبصورت تھی۔ ایسا گدرایا ہوا بدن تھا۔ ایسی کافر ادائیں تھیں کہ راجہ دوسری رانیوں کی خوابگاہوں کو بھول جاتا تھا۔ وہ بڑے غرور سے سینہ تان کر رانیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کہتی تھی۔ "جوہری نے ہیرے کو پرکھ لیا ہے۔ باقی تمام کو کنکر پتھر سمجھ کر پھینک دیا ہے۔"



چمیلی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا نام مہاپدم نند رکھا گیا۔ اس نے مہانندن سے پوچھا۔ "بیٹے کو باپ کا نام ملتا ہے یا ماں کا؟"

وہ فخر سے بیٹے کو چوم کر بولا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بیٹے کو باپ کا نام ملتا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "بیٹے کو باپ سے عزت ملتی ہے یا ماں سے؟"

اس نے کہا۔ "عزت نام اور مرتبہ باپ سے ملتا ہے۔"

"کیا بیٹا بدنام ہو تو باپ کی بھی بدنامی نہیں ہوتی؟"

"بے شک ہوتی ہے۔"

"اگر کوئی اسے نیچ ذات کا کہے گا تو کیا تیری ذات اونچی رہ پائے گی؟"

"نہیں۔ یہ میرے نام سے اونچی ذات کے راجہ کا بیٹا اونچا مان مرتبہ پائے گا۔"

"سب سے اونچا مرتبہ راج گدی پر بیٹھنے سے بیٹے کو ملتا ہے۔ کیا اسے راج سنگھاسن ملے گا؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تُو اپنی باتوں سے الجھا دیتی ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ میری تمام رانیاں راج گھرانوں سے آئی ہیں۔ ان میں سے کسی کے بیٹے کو ولی عہد نہ بنایا تو میرے تمام سسرالی راجاؤں کو اعتراض ہوگا۔ نفرتیں پیدا ہوں گی۔ یہاں ان کے نواسے ہیں۔ وہ اپنے کسی نواسے کو گدی پر بٹھانے کے لئے فوج کشی کر سکتے ہیں۔"

وہ ناراض ہو کر بولی۔ "زیادہ نہ بولو۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ میرے بیٹے کو بس تمہارا نام ملے گا۔ راج پاٹ نہیں ملے گا۔"

اس نے کہا۔ "میں تجھے ناراض نہیں کروں گا۔ صرف ایک راج پاٹ کا مطالبہ چھوڑ کر اپنے بیٹے کے لئے جو مانگے گی وہ دوں گا۔"

چمیلی نے ماں بنتے وقت ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کے بیٹے کو کبھی راجہ نہیں بنایا جائے گا۔ تب وہ اسے کیا بنائے گی؟ اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ آئندہ اسے کیا

کرنا ہے؟ اس نے مہانندن کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وچن دیتے ہو، جو مانگوں گی وہ دو گے؟''

''ہاں۔ وچن دیتا ہوں۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کے لئے جو خواہش کرو گی، اسے پورا کروں گا۔''

''میں چاہتی ہوں، میرے مہاپدم نند کو ایسی سپاہیانہ تربیت دی جائے کہ وہ آگے چل کر فوج کا سیناپتی بن جائے۔''

''یہ تو میرے دل کی بات ہے۔ یہ راجہ بن کر نہ سہی فوج کا سیناپتی بن کر سلطنت کی رکھشا کرے گا۔''

ان کے درمیان یہ معاملہ بڑی محبت سے نمٹ گیا۔ مہاپدم نند جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرنے لگا۔ باپ اپنے وعدے کے مطابق اسے ایک جنگجو سپاہی بننے کی تربیت دیتا رہا۔ چمیلی بیٹے کو تنہائی میں سمجھاتی رہتی تھی کہ اسے راج گھرانے میں سب سے اونچا مقام حاصل کرنا چاہئے یا پھر اس راج گھرانے کا نام ہی مٹا دینا چاہئے۔

مہاپدم نند نے فوج کا سپہ سالار بن کر یہی کیا۔ فوج کے مختلف دستوں میں ایسے ماتحت سپاہی رکھے، جو راجہ سے زیادہ اس کے وفادار تھے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ فوج کے بغیر حکومت قائم نہیں رہتی۔ راجہ اگرچہ خود مختار ہوتا ہے۔ مگر فوج کی وفاداری کا محتاج رہتا ہے۔

مہانندن نے سوچا تھا۔ ''چمیلی کا بیٹا میرا بیٹا ہے۔ وہ سپہ سالار بن کر کبھی غداری نہیں کرے گا۔ میرے بعد اس کا سوتیلا بھائی راجہ بنے گا تو وہ اس کا بھی وفادار رہے گا۔''

کسی سوتیلے بھائی کے راجہ بننے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس نے پوری فوج کو اپنے اعتماد میں لے کر راجہ مہانندن کو ہی زنجیریں پہنا دیں۔ اسے کال کوٹھری میں پہنچا دیا۔ سوتیلے بھائیوں کو قتل کرا دیا۔ مہانندن یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ کال کوٹھری میں ہی مر گیا۔



اس کی موت کے بعد مہاپدم نند نے تمام سوتیلی رانی ماؤں کو محل سے نکال دیا۔ وہ سب ہی کسی نہ کسی راجہ کی بہنیں اور بیٹیاں تھیں۔ جب اپنے اپنے میکے واپس آئیں تو وہ تمام راجہ غصے سے بپھر گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے پاس اپنے ایلچی بھیجے۔ انہیں یہ پیغام دیا کہ ان سب کو یکجا ہو کر فوجی اتحاد قائم کرنا چاہئے۔ وہ متحد ہو کر مہاپدم نند سے اپنی توہین کا بدلہ لے سکیں گے۔

مہاپدم نند نے باپ کو گرفتار کرنے اور بھائیوں کو قتل کرنے سے پہلے یہ سوچ لیا تھا کہ آئندہ اسے کیا کرنا ہے؟ مگدھ کے اطراف میں فوجی اعتبار سے جو سب سے زیادہ طاقتور راجہ تھا، اس کی بیٹی سے اس نے شادی کر کے راجہ کو اپنا سسر بنا لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ تمام دشمن راجہ متحد ہو کر حملہ کرتے۔ اس نے ان پر چڑھائی کر دی۔ دشمنوں کے فوجی اتحاد سے پہلے ہی انہیں منتشر کر دیا۔ اس نے ایسی ایسی چالیں چلیں کہ تمام دشمنوں کو آخرکار اس کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔

یوں شیش ناگ خاندان کا اختتام ہوا۔ مہاپدم نند نے اعلان کیا کہ اس کے نام کے مطابق اس کا راج گھرانہ نند خاندان کہلائے گا۔ اس نے شیش ناگ کے جھنڈے کو جلا کر نند خاندان کا جھنڈا لہرا دیا۔

یہ کیسے ہوتا ہے؟ حکومتیں کیسے بدل جاتی ہیں؟ کیا محض دو بادشاہوں کے لڑنے سے تاریخی واقعات بدل جاتے ہیں؟ اور ایک کے بعد دوسرے بادشاہ کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ جنگ لڑنے اور بادشاہوں کے بدلنے کے پس پردہ اور کون سی قوتیں کارفرما رہتی ہیں؟

اس کا جواب ہے قوت النساء....عورتوں کی قوت....بیگمات اور شہزادیاں، درباری رقاصائیں اور کنیزیں اپنے حسن و شباب سے، اپنی ساحرانہ اداؤں سے ایسی چالیں چلتی ہیں کہ حکمرانوں کی بازیاں پلٹ جاتی ہیں۔

سسپنس ڈائجسٹ میں جو تاریخی کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان میں ان ہی پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ محلوں اور حرم سراؤں

کے دبیز مخملی پردوں کے پیچھے پہلے سازشیں ہوتی ہیں۔ نازک کلائیوں میں چوڑیاں کھنکانے والیاں بڑی حکمت عملی سے ایک چنگاری پھونکتی ہیں۔ پھر میدان جنگ میں شعلے بھڑکنے لگتے ہیں اور بادشاہوں کے مقدر بدلتے چلے جاتے ہیں۔

اجات شترو کا مقدر اس کی بیوی نے بدلا۔ نیچ ذات کی چمیلی نے اپنے بیٹے کے ذریعے مہانندن کا صرف تخت و تاج نہیں چھینا بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان بھی مٹا دیا۔ اگلے صفحات میں بھی عورتوں کی ہوشربا چالیں سمجھ میں آئیں گی۔ عورت ایک ایسی ہستی ہے، جو مرد کے قدموں میں رہتی ہے۔ پتہ نہیں چلنے دیتی کہ وہ سر پر بیٹھی اس کے مقدر سے کھیلتی رہتی ہے۔

تاریخی ادوار کے تسلسل سے نند خاندان کے بعد چندر گپت موریا کا دور شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس کہانی کو عارضی طور پر روکنا ہوگا۔ کیونکہ اس دور میں سکندر اعظم مقدونیہ سے نکل کر فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا دریائے جہلم تک آ پہنچا ہے۔ پہلے اس کا ذکر لازمی ہو گیا ہے۔ اس کے تمام تاریخی حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد یہ کہانی چندر گپت موریا کی طرف واپس آئے گی۔

سکندر اعظم کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے باوجود بہت کچھ لکھنے کو رہ گیا ہے۔ موجودہ کہانی میں ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، جو اب تک پس پردہ رہے ہیں۔ یہ تاریخی کہانیاں عورتوں کے حوالے سے پیش کی جا رہی ہیں۔ جب عورت کی بات آتی ہے تو پہلے ماں کا رشتہ آتا ہے۔ لہٰذا سکندر سے پہلے اس کی ماں کی دلچسپ داستان پیش کی جا رہی ہے۔

دنیا جسے فاتح اعظم کہتی ہے، اس کی ماں کیسی ہوگی؟ وہ ایسی تھی کہ زمین پر زلزلہ بن کر رہی۔ آسمان پر اس کی ایک جھلک کڑکتی ہوئی بجلی دکھائی دیتی تھی۔ زیوس دیوتا کی معشوق پجارن تھی۔ آندھی کی طرح چلتی تھی۔ اسی آندھی نے سکندر جیسے طوفان کو پیدا کیا تھا۔

❁........❁........❁



ستاروں بھرے آسمان تلے وہ پر ہجوم بارات بڑے طمطراق کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی شان و شوکت دیکھنے والوں کو انگشت بدنداں کر رہی تھی۔ بے حساب مشعلوں اور شمعدانوں نے بارات کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔ وہ بارات جہاں سے گزر رہی تھی، وہاں رات میں بھی دن کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ ایسی دھوم دھام پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

رقص و موسیقی کی چلتی پھرتی محفل نے روشنی کے اس قافلے میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ بجلی کی طرح تھرکتی، لہراتی، بل کھاتی سینکڑوں رقاصائیں باراتیوں کے دل موہ رہی تھیں۔ حسن، ادائیں، شوخیاں، رنگا رنگ کھیل تماشے، غرض وہ بارات زندگی کی ہر خوشی سے بھرپور تھی۔ وہاں جوان اور خوبصورت عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ شراب اور شباب کا بھرپور اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود سب ہی کی نظریں اس سنہری رتھ پر جمی ہوئی تھیں، جسے چھ سفید شاہی گھوڑے بڑی شان سے محل کی طرف لئے جا رہے تھے۔

اس شاہانہ رتھ کے اطراف مہین پردے لہرا رہے تھے۔ اس ریشمی حجاب کے پیچھے اولمپیاس کا ریشمی حسن بادلوں میں چھپے چاند کی طرح چھب دکھا رہا تھا۔ ہوا کے شوخ جھونکے کبھی کبھی اسے واضح کرتے تھے تو لگتا تھا، ادھورا چاند پورا ہو گیا ہو۔

سنا تھا، وہ دلہن بہت خوبصورت ہے۔ سر سے پاؤں تک چلتی پھرتی قیامت ہے۔ شاہ فیلقوس نے اس کی خوبصورتی و دلکشی سے متاثر ہو کر ہی اسے اپنی شریکِ حیات بنایا تھا۔ فیلقوس کی حسن پرستی سے سب ہی واقف تھے۔ اس کی منظورِ نظر بننے والیاں بڑی بھرپور ہوتی تھیں۔ بے اختیار یہ کہا جاتا تھا کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی ایسی حسینائیں کہیں نہیں ملیں گی۔ اولمپیاس کے بارے میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ وہ نئی دلہن پچھلی تمام بیگمات سے کئی قدم آگے ہے۔ حسن و جمال میں ایسی ہے کہ چاند اس کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ تمام داشتائیں ستارے ہیں تو اولمپیاس ان کے درمیان چاند کی طرح دمکنے والی ہے۔

بارات بڑی دھوم دھام سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ مقدونیہ کے

دارالسلطنت پیلا پہنچتے ہی اولمپیاس نے سکون کی گہری سانس لی۔ایک طویل انتظار کے بعد من کی مراد پوری ہو رہی تھی۔وہ شاہ فیلقوس کے نام سے منسوب ہوئی تھی۔وہ کوئی گلفام نہیں تھا، نہ ہی وہ اس کے لئے آہیں بھرتی رہی تھی۔ایک بادشاہ کو بڑے رعب اور دبدبے سے تن کر چلنا چاہئے' مگر وہ لنگڑاتا تھا۔اس میں بلا کی مردانہ کشش تھی' بڑا پروقار تھا۔ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتا تھا۔کیونکہ اس کی ایک ہی آنکھ تھی۔دوسری آنکھ ایک حادثے میں ضائع ہوگئی تھی۔وہ اپنی کھنڈر جیسی شخصیت کے باوجود ایک عالیشان عمارت کی طرح تھا۔اولمپیاس کو اس کی خامیوں کی پروا نہیں تھی۔وہ تو بس ایک ہی خواب دیکھتی آئی تھی کہ سلطنت مقدونیہ کی ملکہ ضرور بنے گی اور اس روز زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہوگئی تھی۔

وہ فیلقوس کی بیوی کی حیثیت سے پیلا میں قدم رکھ رہی تھی۔اس کی سیاہ چمکدار آنکھیں فاتحانہ انداز میں یوں مسکرا رہی تھیں' جیسے اس نے بادشاہ کو ہی نہیں' پورے مقدونیہ کو فتح کرلیا ہو۔کامیابی کی ایسی خوشی اس کے حسن و شباب کی چکا چوند میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

دوسری طرف محل میں نئی نویلی دلہن کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔فیلقوس کو علم تھا کہ اولمپیاس کو پھول بہت پسند ہیں لہٰذا اس کے حکم کے مطابق پورے محل کو پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔دروازے سے خوابگاہ تک پھولوں کی پتیوں کا قالین بچھا دیا گیا تھا۔

خوشیاں اور غم' دھوپ اور سائے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔شادی کے رونق میلے میں آرسی نوئی بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔سوکن تو یوں بھی زہریلا کانٹا ہوتی ہے۔آنے سے پہلے ہی زندگی میں زہر گھول دیتی ہے۔اس بات کا صدمہ زیادہ تھا کہ اولمپیاس باقاعدہ ملکہ بن کر آئی تھی۔فیلقوس کی زندگی میں آنے والی باقی حسینائیں داشتہ کا درجہ رکھتی تھیں۔

آرسی نوئی کی بھی یہی حیثیت تھی۔پھر بھی وہ ایک سوکن کی طرح حسد اور کینہ



رکھتی تھی۔وہ سوکن کے حسن و جمال سے خوفزدہ نہیں تھی۔نہ ہی اسے اس بات کا صدمہ تھا کہ شاہ کی پسند بدل گئی ہے۔دُکھ اس بات کا تھا کہ فیلقوس اسے ملکہ بنانے کا وعدہ کر کے مکر گیا تھا۔یوں مکر جانے کی وجہ یہ تھی کہ اولمپیاس صرف حسن کا مجسمہ ہی نہیں تھی' بلکہ جزیرے کے حکمران کی بیٹی بھی تھی۔شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔اس حسینہ کی آمد نے ایک بیگم اور داشتہ کے فرق کو واضح کر دیا تھا۔

فیلقوس برائے نام کئی شادیاں کر چکا تھا۔لیکن اس نے کسی کے سر پر ملکہ کا تاج نہیں سجایا تھا۔جب آرسی نوئی نے بادشاہ کی منظورِ نظر بن کر محل میں قدم رکھا' تب اس کی آنکھوں میں بھی ملکہ بننے کا خواب سجا ہوا تھا۔مگر ایک برس گزر جانے کے باوجود اسے اپنے خواب کی تعبیر نہیں مل رہی تھی اور اب اولمپیاس کی آمد کے بعد تو جیسے رہی سہی امید بھی دم توڑ رہی تھی۔

آرسی نوئی دراصل ایک طوائف تھی۔مقدونی رؤسا اور امراء اس کے حسن و دلکشی کے قصیدے پڑھتے رہتے تھے۔وہ اپنی مترنم آواز اور سحر انگیز اداؤں کا ایسا جادو چلاتی تھی کہ اس کے عاشق رفتہ رفتہ اس کا نام بھول گئے اور اسے آرسی نوئی کے بجائے ساحرہ کے نام سے مخاطب کرنے لگے۔پورے مقدونیہ میں اس کے قیامت خیز حسن کی دھوم مچی ہوئی تھی۔اس کے چرچے فیلقوس کے کانوں تک پہنچے تو وہ حسن و شباب کا رسیا اس ساحرہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہوگیا۔لیکن بدنامی کے ڈر سے اس بدنام کوچے میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

لہٰذا اس نے اپنے ایک خاص درباری کے ذریعہ آرسی نوئی کو یہ پیغام بھجوایا۔

''اے ساحرہ! میں نے تجھے دیکھا نہیں ہے' لیکن دیکھے بغیر تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں۔تیرے بارے میں جتنا سنا ہے' اس سے زیادہ جاننے کا متمنی ہوں۔میں تیرے کوچے میں نہیں آسکتا۔اس لئے تجھے شاہی محل میں آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔آج رات دوسرے پہر میرا یہ درباری تجھے لینے آئے گا۔میں نے کبھی کسی بازاری عورت کو پیغام نہیں بھجوایا۔تو خوش نصیب ہے کہ بادشاہِ وقت کی منظورِ نظر بن کر شاہی

محل میں چند یادگار راتیں گزارنے والی ہے۔“

آرسی نوئی یہ پیغام سن کر زیرِ لب مسکرانے لگی۔ اندر ہی اندر خوشی سے لہرانے لگی کہ شاہ مقدونیہ اس کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے۔ اس بدنام زمانہ کوچے کی عورت کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی کہ اس کے نام شاہی پیغام آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتا دے ملک بھر میں یہ اعلان کرتی پھرے کہ مقدونیہ کا بادشاہ اس پر عاشق ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ چند راتیں گزارنے کا متمنی ہے۔

آرسی نوئی ایک موقع شناس عورت تھی۔ اتنی بڑی خوشی ملنے کے باوجود بڑے تحمل سے کام لے رہی تھی۔ جوابی پیغام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ننھی سی چنگاری کو شعلہ کیسے بنایا جاتا ہے؟ بادشاہ کے دل میں ابھی صرف اسے دیکھنے اور حاصل کرنے کی لگن پیدا ہوئی تھی۔ ایسے نام نہاد عشق کا بھوت ایک دو یا چار راتوں کے بعد سر سے اتر جاتا ہے جبکہ وہ اس کے شوق دید کو مزید بھڑکا کر اپنی اہمیت میں اضافہ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے بڑی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اس درباری سے پوچھا۔ ”کیا تُو نے کبھی کسی کنویں کو پیاسے کے پاس خود چل کر آتے دیکھا ہے؟“

اس درباری نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں....“

”تو پھر میں خود چل کر شاہی محل میں کیسے جا سکتی ہوں؟ بادشاہِ وقت کو پیاس لگی ہے۔ اسے کنویں کے پاس آنا ہوگا۔“

اس نے ایک ذرا تعجب سے پوچھا۔ ”یعنی تُو محل میں جانے سے انکار کر رہی ہے؟“

”ہرگز نہیں۔ اگر وہ واقعی میرا عاشق ہے تو خود مجھے لینے میرے دروازے پر آئے۔ میں ننگے پاؤں اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔“

درباری نے اس کا یہ پیغام فیلقوس کو سنایا۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چاہتا تو اسی وقت ایک فوجی دستہ بھیج کر اس حسینہ کو زبردستی



اٹھوا لیتا اور اپنے قدموں میں لا گراتا۔ مگر آرسی نوئی کی یہ ادا دل کو بھا رہی تھی۔ وہ قریب آنے سے پہلے دور رہ کر اسے تڑپا رہی تھی۔ اپنا جلوہ دکھانے سے پہلے اس کے شوقِ دید کو بھڑکا رہی تھی۔

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ دوسری رات ہی حلیہ بدل کر اپنے درباری کے ساتھ اس کوچے میں پہنچ گیا۔ اس نے رتھ کو گلی کے نکڑ پر رکواتے ہوئے درباری سے کہا۔ ”جا... اس ساحرہ سے کہہ دے میں نے اس کی شرط پوری کر دی ہے۔ یہاں اس کا منتظر ہوں۔ وہ فوراً چلی آئے۔“

وہ اس کے حکم کے مطابق سواری سے اتر کر آرسی نوئی کے دروازے پر آیا تو وہ اس کے پیچھے جھانکتے ہوئے بولی۔ ”تنہا آیا ہے؟ بادشاہ کہاں ہے؟“

”وہ گلی کے نکڑ پر رتھ میں تیرا انتظار کر رہا ہے۔ چل... جلدی چل....“

”جب وہ اس کوچے میں آ ہی گیا ہے تو اسے میرے دروازے پر آنے میں کیا قباحت ہے؟“

”وہ بادشاہ ہے۔ کیا یہ کم ہے کہ تجھے لے جانے کے لئے خود چل کر یہاں تک آیا ہے؟ بدنامی کے خیال سے رتھ میں بیٹھا ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو....“

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”بادشاہ نے اپنے پہلے پیغام میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ مجھ پر عاشق ہو گیا ہے اور عاشق دنیا کی پروا نہیں کرتا۔ پھر وہ تو حاکمِ وقت ہے، خود مختار ہے، جو چاہے کر سکتا ہے جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ اسے تو بے خوف ہو کر میرے دروازے پر آنا چاہئے۔“

درباری اس کا یہ پیغام لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اس کے پیغامات سے اندازہ ہو رہا ہے وہ حسین ہی نہیں ذہین بھی ہے۔ ایسی عورت کو اس کوچے میں نہیں رہنا چاہئے۔“

رات کا دوسرا پہر گزر رہا تھا۔ گاہکوں کی آمد و رفت میں کسی حد تک کمی آ گئی تھی۔ گلی میں ذرا سناٹا ہوا تو وہ رتھ سے اتر کر درباری کے ساتھ آرسی نوئی کے

دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ فوراً ہی حجاب کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ تیری بڑائی ہے کہ تُو نے اس ادنیٰ کنیز کا مان رکھا۔ میں سر کے بل تیرے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تیری ضد نے آخر ایک بادشاہ کو اس بدنام علاقے میں قدم رکھنے پر مجبور کر ہی دیا۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”تُو نے یہاں بادشاہ کی حیثیت سے نہیں، ایک عاشق کی حیثیت سے قدم رکھا ہے۔ اگر بادشاہ ہوتا تو میرے پیغامات سے جھنجھلا کر مجھے اٹھوالیتا۔ یہاں آنے کی زحمت نہ کرتا۔“

”میں شاہی محل سے تیرے دروازے تک چلا آیا اور تُو پھر بھی حجاب میں ہے؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”جب تک آگ کو اچھی طرح بھڑکایا نہ جائے، تب تک ہانڈی پکانے کا مزہ نہیں آتا۔“

وہ متاثر ہو کر بولا۔ ”بہت خوب۔ تیرا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔“

آرسی نوئی نے اپنے گھر سے شاہی محل تک اور محل سے اس کی خوابگاہ تک بادشاہ کو اپنا چہرہ نہ دکھایا۔ وہ اداؤں سے بھرپور حسینہ فیلقوس کو متاثر کر رہی تھی۔ اس کا دل جیت رہی تھی۔ آرسی نوئی کی حکمتِ عملی نے آخر کار یہ رنگ دکھایا کہ کچھ عرصے بعد ہی فیلقوس نے اس سے شادی کر لی اور اسے ہمیشہ کے لئے اپنے محل میں لے آیا۔ ایک کے بعد ایک شادیاں کرنے والا بیویوں کو کنیزوں کی طرح برتنے لگتا ہے۔ اسی لئے اس کی خلوت میں آنے والیاں محض داشتائیں بن کر رہ جاتی ہیں۔

وہ اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسی لئے اولمپیاس سے خوفزدہ تھی۔ وہ آنے والی سوکن ہر لحاظ سے اس سے برتر تھی اور اس کی یہی برتری آرسی کو سمجھا رہی تھی کہ ملکہ کا تاج اس سوکن کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔

اس کی ایک وفادار کنیز نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے، اولمپیاس پر دیوتاؤں کے دیوتا زیوس کا سایہ ہے۔ تب ہی تو وہ اتنی ضدی اور مغرور ہے۔“

آرسی نوئی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”دیوتا زیوس کا سایہ....؟ تُو کہنا کیا چاہتی



ہے؟“

وہ اس کے قریب آ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ”جو معلوم ہوا ہے، وہی بتا رہی ہوں۔ بلکہ یہاں تک سنا گیا ہے کہ دیوتا زیوس اکثر اولمپیاس کے اندر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ وہ اس کے مندر کی خاص پجارن ہے۔ اسی لئے دیوتا اس پر مہربان رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ ساری باتیں افواہ ہوں۔ لیکن....“

”لیکن کیا....؟“

وہ آرسی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اولمپیاس میں ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے۔ تب ہی تو وہ زہریلے سانپوں سے ڈرتی نہیں ہے۔ بارات کے ساتھ اس کے درجنوں پالتو سانپ بھی لائے جا رہے ہیں۔“

”ہاں۔ مجھے فیلقوس نے بتایا ہے۔ اولمپیاس کو سانپ پالنے کا شوق ہے۔“

”کیا ان تمام باتوں سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ایک خطرناک عورت ہے؟ اگر دیوتا زیوس والی بات افواہ نہیں ہے تو مقدونیہ کی ملکہ کا تاج اسی کے سر کی زینت بنے گا۔“

تازہ ترین اطلاعات نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔ ایک تو وہ حکمران کی بیٹی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ حسن و جمال میں یکتا تھی۔ اب یہ نئی خبر مل رہی تھی کہ اس پر دیوتا زیوس مہربان ہے۔ اس کی مہربانیوں نے اسے مغرور اور خودسر بنایا ہوا ہے۔

آرسی نوئی سوچ میں پڑ گئی۔ ”وہ ضدی اور خودسر سہی لیکن ملکہ کا تاج کسے پہنایا جائے گا، یہ فیصلہ تو فیلقوس ہی کرے گا۔ اولمپیاس کے آنے سے پہلے مجھے بادشاہ سے بات کرنی چاہئے۔“

چنانچہ اس نے فیلقوس کو پیغام بھجوایا کہ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ خوابگاہ میں آیا تو آرسی نوئی نے کہا۔ ”میں اولمپیاس کے بارے میں بہت کچھ سن رہی ہوں۔ لیکن ابھی ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔“

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”سنا ہے، اس پر دیوتا زیوس مہربان ہے؟“

وہ زیرِلب مسکرانے لگا۔ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ میں نے بھی سنا ہے۔''

''تُو نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟''

''جس بات کا یقین نہ ہو۔ اس کا ذکر کر کے فائدہ....؟''

اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تو کیا یہ بات جھوٹ ہے؟''

وہ ایک ذرا لاپروائی سے بولا۔ ''سچ بھی ہو سکتی ہے۔''

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے' جیسے اولمپیاس آنے سے پہلے اس محل پر اپنا جادو پھونک رہی ہے۔''

''دراصل تُو اس سے خوفزدہ ہے۔''

''ہاں۔ میں خوفزدہ ہوں۔ کیونکہ اپنی حیثیت پہچانتی ہوں۔ وہ مجھ سے سب کچھ چھین لے گی... سب کچھ... حتیٰ کہ تجھے بھی... میری کمتری مجھے خوفزدہ کر رہی ہے۔''

''تُو ایسا کیوں سوچ رہی ہے؟ کیا بادشاہ کی بیوی کمتر ہو سکتی ہے؟''

''تیری بیگمات تو بہت ہیں۔ لیکن برتری اسے ہی حاصل ہو گی' جسے ملکہ کا تاج پہنایا جائے گا۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں' کیا وہ خوش نصیب اولمپیاس ہے....؟''

فیلقوس اس سوال پر مسکرانے لگا۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔ ''فی الحال کچھ کہا نہیں جا سکتا، اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔''

تھوڑی دیر بعد ہی پیلا میں اور شاہی محل میں اولمپیاس کی آمد کی دھوم مچ گئی۔

آرسی نوئی اپنی خوابگاہ کے ایک جھروکے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سنہری رتھ محل کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا تھا۔ فیلقوس بہت ہی مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے رتھ کے سامنے آ کر' سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک ذرا جھکتے ہوئے اولمپیاس کو خوش آمدید کہا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر رتھ سے اُتر گئی۔

سفید براق لباس میں سنگ مرمر سے تراشا ہوا مجسمہ لگ رہی تھی۔ ماہتابی چہرہ



جالی دار حجاب میں دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ چُست عروسی لباس اس کا انگ انگ واضح کر رہا تھا۔ کچھ حسن کا غرور تھا۔ کچھ نئے نویلے رتبے کا بھرم تھا کہ بدن کے نشیب و فراز کمان کی طرح تن گئے تھے۔ سینکڑوں نگاہیں سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ واقعی بے مثال تھی۔

اس کی شخصیت نے ایسا سحر پھونکا تھا کہ چند ساعتوں کے لئے وہاں خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر تالیوں کی گونج میں اور پھولوں کی بارش میں وہ فیلقوس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگی۔ بڑا شاہانہ انداز تھا۔ ایسا شاہی رعب اور دبدبہ تھا کہ بادشاہ کی لنگڑاہٹ کا عیب بھی اس شور اور ہنگامے میں گم ہو گیا تھا۔

اولمپیاس کے عروسی لباس کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے پیچھے قالین پر پھیلا ہوا تھا۔ اس حصے کو چار کنیزیں تھام کر ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔

آرسی نوئی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اصولاً اسے بھی نئی دلہن کے استقبال کے لئے وہاں جانا چاہئے تھا۔ لیکن فیلقوس نے تمام بیگمات کو منع کر دیا تھا کہ ان میں سے کوئی اولمپیاس کے استقبال کے لئے اپنی خوابگاہ سے باہر نہیں آئے گی۔ وہ تجربہ کار تھا' یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سوکنوں کا سامنا ہوتا ہے تو ان کے درمیان کسی نہ کسی بات پر نوک جھونک ضرور ہوتی ہے۔ اس نے کسی بدمزگی سے بچنے کے لئے یہ حکم جاری کیا تھا۔

وہ اپنی دلہن کے ساتھ حجلۂ عروسی میں چلا گیا تھا۔ چھ سات کنیزیں بھی ان کی خدمت گزاری کے لئے وہاں موجود تھیں۔ وہ دولہا دلہن کو کھانا کھلانے اور لباس تبدیل کرانے کے بعد باہر آنے والی تھیں۔ آرسی نوئی اپنی خوابگاہ میں ٹہل رہی تھی۔ اس کے لئے کھانا لایا گیا۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بستر پر آ کر لیٹی تو نیند نے قریب آنے سے انکار کر دیا۔ وہ کبھی لیٹ رہی تھی' کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ بے چینی ایسی تھی کہ کسی طور چین نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ چونک گئی۔ دروازے پر دستک سنائی دے رہی تھی۔ وہ فیلقوس کی مخصوص دستک تھی۔ اس نے تعجب سے سوچا۔

''فیلقوس....؟''

وہ بستر سے اتر کر تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کے قریب آئی پھر اسے پوری طرح کھول دیا۔ وہ ہاتھ میں جام اٹھائے نشے میں چُور دروازے کے باہر جھوم رہا تھا۔ دو پہریدار اس سے ذرا فاصلے پر سر جھکائے مؤدب انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ آرسی نوئی کو دیکھ کر ڈگمگاتی ہوئی آواز میں بولا ”مجھے پتہ تھا... تُو جاگ رہی ہوگی....“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تُو اس وقت یہاں.....؟“

وہ ڈگمگاتا' لڑکھڑاتا ہوا خوابگاہ کے اندر چلا آیا۔ آرسی نوئی نے ان پہریداروں کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”تجھے تو اولمپیاس کے پاس رہنا چاہئے تھا۔ یہاں کیوں چلا آیا....؟“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”طویل مسافت نے اسے تھکا مارا ہے۔ میں اس کے پاس رہ کر کیا کرتا...؟ وہ تو لیٹتے ہی سوگئی۔ کہتی ہے' جو ہوگا' کل رات کو ہوگا....“

اس نے جام کو ایک طرف پھینک کر آرسی کو بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر اس کے ساتھ بستر پر چلا آیا۔ وہ اس کے پاس تھی' لیکن دماغ اولمپیاس کی طرف بھٹک رہا تھا۔ یہ بات ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی کہ اس آنے والی کا رعب اور دبدبہ ایسا ہے کہ بادشاہِ وقت اس کی مرضی کے خلاف اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ نئی دلہن چاہے جتنی بھی تھکی ہاری کیوں نہ ہو' دولہا کے جذبات کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے۔ اولمپیاس کی یہ حکمت عملی سمجھا رہی تھی کہ وہ جلد ہی پچھلی تمام بیگمات پر سبقت لے جائے گی۔

آرسی نوئی نے قائل ہو کر سوچا۔ ”دیوتا زیوس والی بات سچ لگ رہی ہے۔ ورنہ کسی بھی بیگم کی کیا مجال کہ وہ فیلقوس کو اپنے قریب آنے سے روک سکے۔“

یہ بہت بڑی بات تھی کہ اولمپیاس نے پہلی رات فیلقوس کو اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ دوسرے دن وہ امورِ سلطنت میں مصروف رہا۔ اس نے دارالسلطنت پیلا کے شمال' مشرقی اور مغربی حصے کے تمام وحشی قبائل کو زیر کر کے اپنا باج گزار بنا لیا تھا۔ وہ



لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں جانوروں جیسی زندگی گزارتے رہے تھے۔ انہیں مقدونی رعایا کا حصہ بنانے سے پہلے ان کی تربیت ضروری تھی۔

اس مقصد کے لئے فیلقوس نے انہیں چار دیواری مہیا کی تھی۔ وہ سمور پہنتے تھے۔ انہیں مقدونی لباس پہننے کا ڈھنگ سکھایا گیا۔ پہلے وہ مقدونیوں سے خوفزدہ رہتے تھے۔ لیکن بادشاہ کی رحمدلی دیکھ کر اس کے وفادار بن گئے تھے۔ وحشی جوان بہت نڈر اور شہزور تھے۔ انہیں تربیت دینے کے بعد فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ فیلقوس نے ان کے ذریعہ کئی علاقے فتح کئے تھے۔ مفتوح علاقوں سے ملنے والے خزانے کو اور عورتوں کو وحشیوں کے درمیان ہی تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فیلقوس کی ایسی حکمتِ عملی ان کے دل جیت رہی تھی۔

جب اولمپیاس سے شادی ہوئی' ان دنوں قابوس نامی ایک وحشی جوان نے فیلقوس کے خلاف محاذ بنایا ہوا تھا۔ وہ مقدونی فوج کا ایک جنگجو سپاہی تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ وہ اپنے پیچھے ایک جوان اور خوبصورت عورت کو چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اس مرنے والے کی دوسری بیوی اور اس جوان کی سوتیلی ماں تھی۔

وحشی قبائل فیلقوس کے زیر اثر آنے کے بعد اپنے بہت سے رسم و رواج چھوڑ چکے تھے۔ ان میں سے ایک دستور یہ بھی تھا کہ وہ پیدا کرنے والی ماں کے علاوہ دنیا کی ہر عورت کو اپنی بیوی بنا سکتے تھے۔ سگی بہنوں سے شادی کا رواج بھی عام تھا۔ باپ مرتا تھا تو اس کے جوان بیٹے اپنی سوتیلی ماؤں سے شادی کر لیتے تھے۔ وہ وحشی جوان اس جدّی پشتی دستور کے مطابق اس سوتیلی ماں کو اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن فیلقوس کا اعتراض اسے جنون میں مبتلا کر رہا تھا۔

اس نے قبیلے کے ایک بزرگ سے کہا۔ ”ہم نے بادشاہ کے حکم پر اپنے تمام رسم و رواج کو ترک کر دیا ہے۔ اس کے دستور کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں لیکن سوتیلی ماں سے شادی کو ناجائز قرار دے کر وہ اچھا نہیں کر رہا ہے۔“

بزرگ نے کہا۔ ”ایک خوبصورت عورت نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ یہ

کیوں نہیں سوچتا کہ وہ رحمدل بادشاہ ہمارا حکمران ہے' ہمارا محسن ہے۔ کیا تُو دیکھتا نہیں' وہ کس طرح انصاف پسندی سے ہمارا حصہ ہمیں دے دیتا ہے۔ جبکہ حاکم وقت ہے' خودمختار ہے۔ چاہے تو ہمیں بھوکا مار دے۔ ہمارا اناج بند کر دے لیکن اس نے ہمارے تمام جوانوں کو ملازمتیں دی ہیں۔ ہمیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔''

دوسرے بوڑھے شخص نے کہا۔ ''ہم سردیوں میں کھلے آسمان تلے ٹھٹھرتے تھے' گرمیوں کی تیز دھوپ میں جھلستے رہتے تھے۔ اس محسن نے ہمیں رہنے کے لئے یہ پختہ مکانات دیئے ہیں۔ تُو اس کی بغاوت سے باز آجا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کر! اس کا قانون اور یہ مہذب زندگی ہمارے رسم و رواج سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں کوئی بغاوت نہیں کر رہا ہوں۔ بس ایک بات جانتا ہوں' دشالے میری بیوی بنے گی اور ضرور بنے گی۔''

''ایسا تب ہی ہوگا' جب بادشاہ چاہے گا۔''

اس نے بے بسی سے کہا۔ ''آج اندازہ ہو رہا ہے' آزادی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے؟ ہم جنگلوں میں غیر مہذب ہی سہی.... لیکن آزاد تو تھے۔''

اس کی اس بات نے کتنے ہی نوجوانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بغاوت کی یہ ننھی سی چنگاری کسی بھی وقت شعلہ بن سکتی تھی۔ فیلقوس کے حکم کے مطابق اس نوجوان کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ وہ اسے ایک آنکھ سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تُو ہماری فوج کا ایک جانباز سپاہی ہے۔ پہلے صرف تیر اندازی میں ماہر تھا۔ میرے سپاہیوں نے تجھے مختلف جنگی ہتھیاروں کا استعمال بھی خوب سکھا دیا ہے۔ لیکن یہ عسکری تربیت اس لئے نہیں دی گئی کہ تُو شاہ مقدونیہ سے دشمنی کرتا پھرے....''

وہ جلدی سے بولا۔ ''تُو ہمارا آقا ہے' ہمارا محسن ہے۔ میں تجھ سے دشمنی نہیں کر سکتا۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ.... دشالے میری ہو جائے۔''



وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''لیکن میرے ملک کا قانون میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دے گا۔ ماں چاہے سوتیلی ہی کیوں نہ ہو' ماں ہوتی ہے۔ وہ تیرے آنجہانی باپ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتی رہی ہے۔ اس کے لئے ایک بیٹا پیدا کر چکی ہے اور....''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''وہ مجبور تھی۔ ہم پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے سے محبت کرتے آرہے ہیں۔ میرا باپ یہ سب کچھ جانتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے زبردستی دشالے پر قبضہ جما لیا۔ اسے بیوی بنا کر مجھے رقابت کی آگ میں جلاتا رہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں تھی۔''

''وہ خوش تھی یا نہیں تھی۔ بس اتنا سمجھ لے کہ وہ تیری قسمت میں نہیں ہے۔ نہ تجھے پہلے ملی تھی' نہ اب مل سکے گی۔''

بادشاہ کی بات سن کر اس کے تیور بدل گئے۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے' پھر مٹھیاں بھینچ لیں۔ جذبات سے لرزتے ہوئے کہا۔ ''ہم تیرے ہر حکم کے آگے سر جھکاتے ہیں' تجھے اپنا محسن مانتے ہیں۔ تیرے فرمان کے مطابق اپنے آباؤاجداد کے تمام دستور چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن میں.... میں دشالے کو نہیں چھوڑ سکتا۔ نہیں چھوڑ سکتا....''

وہ شاہی آداب کو بھول کر جوش و جنون میں بولتا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ایک وزیر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس جوان کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔ اگر اس نے بغاوت کی آگ بھڑکا دی تو بہت کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا۔''

بادشاہ نے ناگواری سے کہا۔ ''کیا میں بغاوت سے خوفزدہ ہو کر اس کا یہ گھٹیا مطالبہ تسلیم کر لوں؟ آج یہ سوتیلی ماں کو بیوی بنانے کی بات کر رہا ہے۔ کل کوئی اور اپنی سگی بہن سے شادی کا مطالبہ پیش کر دے گا۔ اچھائی اتنی جلدی نہیں پھیلتی' جتنی تیزی سے برائی پھیلتی ہے۔ ان کے ایسے مطالبات مقدونیوں پر بھی اثر انداز ہوں گے۔ کیا میں بغاوت سے بچنے کے لئے اپنے قانون کا' اپنے مذہب کا اور اپنی

سلطنت کا چہرہ بگاڑ دوں؟''

وزیر نے کہا۔ ''وحشی قبائل کے سینکڑوں جوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا ہے۔ ان کی جنگجوئی اور شہزوری سے تُو اچھی طرح واقف ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ وحشی ہماری فوج کی آدھی طاقت ہیں۔ ان سے بنا کر رکھنی ہوگی۔ ورنہ ہمارا جوتا‘ ہمیں ہی کاٹنے لگے گا۔''

وزیر نے بڑی ٹھوس اور مدلّل بات کہی تھی۔ فیلقوس سوچ میں پڑ گیا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ اگر اس جوان کا مطالبہ تسلیم نہ کیا جاتا تو بغاوت کی آگ اس کی آدھی طاقت کو فنا کر سکتی تھی اور اگر یہ شادی کرادی جاتی تو آئندہ مزید مسائل سر اٹھانے والے تھے۔ فیلقوس معاملہ فہم تھا۔ لیکن اس وقت الجھ گیا تھا۔ فی الحال اس نوجوان کو ہلاک بھی نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اس کی ہلاکت کا الزام سیدھا مقدونی حکومت کے سر آتا۔ اس طرح دوسرے نوجوان مشتعل ہو سکتے تھے۔ ویسے بھی وہ فوج کا ایک جنگجو سپاہی تھا۔ ایک دستے کا سالار تھا۔ اس کی ہلاکت فوج کے ایک بڑے حصے کو منتشر کر سکتی تھی۔

وہ دن بھر وزیروں اور مشیروں کے درمیان بیٹھا اس مسئلے کا مناسب حل تلاش کرتا رہا۔ لیکن عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ خود کو ٹٹولنے لگا۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس کا دل و دماغ اولمپیاس کی طرف بھٹک رہا ہے۔ وہ اپنی ہو کر بھی اب تک اپنی نہیں ہوئی تھی۔ میکے سے سسرال تک کے طویل سفر نے اسے ایسا نڈھال کیا تھا کہ سہاگ کی پہلی رات اپنے دولہا کی آغوش میں آنے سے پہلے ہی اس پر نیند حاوی ہونے لگی تھی۔

اس حسین ساحرہ نے بڑے ہی ناز و انداز سے کہا تھا۔ ''ایسی تھکن اور بیزاری کے ساتھ سہاگ رات کا مزہ کیا خاک آئے گا؟ تُو آج اپنی کسی بھی بیگم کے پاس چلا جا۔ میں کل رات تیری منتظر رہوں گی۔''

وہ جام پر جام پی رہا تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ تین چار کنیزیں اس کی خدمت گزاری میں مصروف تھیں۔ کوئی اس کی زلفیں سنوار رہی تھی۔ کوئی پاؤں دھلا رہی تھی



اور کوئی زیورات اتارنے کے بعد گیلے کپڑے سے اس کے چہرے کو بڑی نفاست سے صاف کر رہی تھی...

وہ سیاسی مسئلہ میں الجھتے الجھتے اولمپیاس کی طرف بھٹک گیا۔ وہ دلہن بنانے کے بعد بھی اسے حاصل نہ کر سکا تھا۔ جو چیز ملتے ملتے بھی نہ ملے‘ اس کی طلب شدت اختیار کر لیتی ہے۔ قابوس کو بھی دشا لے مل سکتی تھی مگر دسترس میں ہو کر بھی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ایسے وقت شاہ نے اپنی شدتِ طلب کو دیکھا اور تمام اہم امور کو ادھورا چھوڑ کر محل میں پہنچ گیا۔

پتہ چلا‘ وہ غسل کر رہی ہے۔ وہ اس کی خوابگاہ میں چلا آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں ٹھٹک گیا۔ شاہانہ مسہری کے دائیں طرف دیوتا زیوس کا بڑا سا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں درجن بھر شمعیں روشن کی گئی تھیں۔ وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک کنیز اس کے لئے جام و مینا لے کر خوابگاہ میں آئی تو اس نے پوچھا۔ ''یہ مجسمہ یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟''

وہ اسے جام پیش کرتے ہوئے بڑے ادب سے بولی۔ ''اولمپیاس کا حکم تھا۔''

اس نے جام لے کر ہونٹوں سے لگالیا۔ پلٹ کر خوابگاہ کے جھروکے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت ایک بار پھر چونک گیا۔ بستر کے بائیں طرف جھروکے کے پاس اولمپیاس کے پالتو سانپوں کا وہی بڑا سا پٹارہ رکھا ہوا تھا‘ جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ پٹارہ لوہے کی جالیوں سے بنایا گیا تھا۔ ان جالیوں سے دکھائی دینے والے رینگتے ہوئے سانپ بڑے ہیبت ناک لگ رہے تھے۔

اس نے ناگواری سے کہا۔ ''انہیں تو باہر باغیچے میں رکھوایا گیا تھا۔''

کنیز نے کہا۔ ''اولمپیاس کا حکم ہے‘ انہیں خوابگاہ میں رکھا جائے گا۔''

اس نے ایک گھونٹ میں جام ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بستر کے اُس طرف زیوس کا مجسمہ کھڑا ہے۔ اِس طرف یہ زہریلے کیڑے رینگ رہے ہیں۔ میں یہ سب برداشت نہیں کروں گا۔ جا.... ملازموں سے کہہ دے

"انہیں میری خوابگاہ سے باہر لے جائیں۔"

اولمپیاس دو کنیزوں کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ اس کا حکم سن کر ٹھٹک گئی۔ اس نے ایک ذرا گھور کر فیلقوس کو دیکھا۔ وہ ایسے زاویے سے کھڑا ہوا تھا کہ اپنی بجھی ہوئی آنکھ سے اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کنیز اسے جام پیش کر رہی تھی۔ ایسے وقت اولمپیاس نے اسے مخاطب کیا۔ اس کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ دھلی دھلائی، نکھری نکھری سی بڑی ہی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "شاہ مقدونیہ کچھ برہم دکھائی دے رہا ہے؟"

وہ جام کو حلق میں انڈیلنے کے بعد اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "کیا مجھے برہم نہیں ہونا چاہئے؟ تُو نے اس خوابگاہ کو آدھا مندر اور آدھا چڑیا گھر بنا دیا ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور اسے ایک آنکھ سے تول رہا تھا۔ جبکہ ترازو کے دو پلڑوں سے تولا جاتا ہے۔ وہ مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ شراب سے بھری صراحی کی طرح للچا رہی تھی۔ وہ گھونٹ گھونٹ اسے اپنے اندر اتار لینا چاہتا تھا۔ وہ ایک اور جام حلق سے اتارتا ہوا اس کے قریب آ رہا تھا۔ رات سے اب تک کی دوری نے آتشِ شوق کو اتنا بھڑکا دیا تھا کہ وہ کنیزوں کی پروا کئے بغیر ڈگمگاتی، لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اس کے بھڑکتے ہوئے شباب کے قصیدے پڑھنے لگا۔

اولمپیاس نے فوراً ہی کنیزوں کو حکم دیا کہ وہ خوابگاہ سے باہر چلی جائیں اور دروازہ بند کر دیں۔ بند دروازے کے پیچھے وہ نشے میں ڈولنے والا اس کے حسن و شباب کو تولنے لگا۔ ان لمحات میں وہ دیوتا زیوس کے مجسمے کو اور زہریلے سانپوں کو یکسر بھول گیا تھا اور کیسے نہ بھولتا، جبکہ وہ لمحہ لمحہ اس کے ہوش اُڑا رہی تھی۔

===✿===



رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا۔ اُجلی دودھیا چاندنی جھیل کے پانی سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ دور تک مچلتی، تھرتھراتی لہریں یوں جھلملا رہی تھیں، جیسے سینکڑوں روپہلے آنچل ہوا کے دوش پر لہراتے چلے جا رہے ہوں۔ دشالے کی نگاہیں ان جھلملاتی لہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ قابوس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "جب سے آئی ہے، خاموش بیٹھی ہے۔ کس سوچ میں گم ہے؟"

وہ خیالات سے چونکتے ہوئے بولی۔ "ابھی تو ایک ہی سوچ ہے کہ ہمارا ہوگا کیا....؟ تیرے باپ نے زبردستی مجھے اپنا کر ہمارے لئے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔"

وہ بولا۔ "اگر بادشاہ راضی ہو جائے تو کوئی مشکل نہیں رہے گی۔"

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہم عورتیں بھی کیا ہوتی ہیں؟ اپنی مرضی سے جی بھی نہیں سکتیں۔ میں تو خوشیوں کے لئے ترس کر رہ گئی ہوں۔ پہلے تیرے باپ نے مجھ پر دھونس جمائی۔ چار برس تک میری بوٹیاں نوچتا رہا۔ اب بادشاہ کے فیصلے کا انتظار ہے۔ وہ چاہے گا تو ہم ایک ہوں گے ورنہ...."

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بولا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ اس کانے بادشاہ کا فیصلہ کچھ بھی ہو، ہم ایک ہو کر رہیں گے۔"

"وہ ہمارا حکمران ہے۔ تُو اس کے فیصلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔"

وہ بولا۔ ”کچھ نہیں کر سکوں گا تو تجھے لے کر یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ وہ لنگڑا ہمارے پیچھے نہیں آ سکے گا۔“

”بچوں جیسی باتیں نہ کر۔ مجھے بھگا کر کہاں لے جائے گا؟ فیلقوس کے سپاہی کتوں کی طرح تلاش کرتے ہوئے ہماری آزادی اور ہماری خوشیوں تک پہنچ جائیں گے۔“

”یہ زمین بہت بڑی ہے۔ ہم کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں گے۔“

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔“

وہ اس کے بازوؤں کو جکڑتے ہوئے بولا۔ ”جانتا ہوں۔ لیکن تجھے پانے کے لئے میں آگ کا دریا بھی پار کر سکتا ہوں۔“

وہ محبت سے سرشار ہو کر اس کے پہلو سے لگ گئی۔ پھر ایک ذرا چونک کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”بہت وقت گزر گیا ہے۔ میرا بچہ بھوکا ہوگا۔ اب میں چلتی ہوں۔“

قابوس نے ناگواری سے کہا۔ ”ایک تو یہ بچہ سارا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے' وہ بڈھا مرنے کے بعد بھی اس سنپولے کے ذریعہ ہمارے پیار میں رکاوٹ ڈالتا رہتا ہے۔“

وہ بچے کے خلاف اکثر ہی زہر اگلتا رہتا تھا۔ دشالے نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”اس کے لئے تیری یہ نفرت میرا دل دہلاتی رہتی ہے۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ وہ صرف میرا بچہ ہے۔ تجھے میرے حوالے سے اس سے محبت کرنی چاہئے۔“

”اس سے محبت کرنا ضروری نہیں ہے۔“

”کیوں ضروری نہیں ہے؟ آئندہ وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ تو.....“

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”یہ خیال دل سے نکال دے۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہے گا۔ شادی کے بعد تُو اسے میری ماں کے حوالے کر دے گی۔“

وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بے یقینی سے بولی۔ ”یہ... یہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟ وہ



میری جان ہے، میرے کلیجے کا ٹکڑا ہے، میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے تو تجھے یہ کرنا ہی ہوگا۔“

”اپنی محبت کے ترازو میں میری ممتا کو نہ تول.... میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔“

اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”اور میرے بغیر....؟“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”تیرے بغیر تو اب تک جیتی آئی ہوں۔ شاید آئندہ بھی جی لوں گی۔ ایک عورت اپنے محبوب سے دور ہو کر زندہ رہ سکتی ہے۔ لیکن اپنے بچے کو نہیں چھوڑ سکتی۔“

وہ اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا پاگل ہوگئی ہے؟ اس بچے کے لئے مجھے چھوڑنا چاہتی ہے؟“

وہ اس کے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”میں کچھ نہیں چاہتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ میرا بچہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ اگر تُو مجھ سے سچی محبت کرتا ہے تو تجھے میری ممتا کا خیال کرنا چاہئے۔“

”میں تیرے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن اسے برداشت نہیں کروں گا۔ تُو سمجھتی کیوں نہیں' یہ تیرے رشتے سے میرا بیٹا نہیں' باپ کے رشتے سے سوتیلا بھائی ہوگا اور میں سوتیلے کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔“

وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ”تو پھر مجھے بھول جا۔ کیونکہ میں اس کے لئے پوری دنیا کو چھوڑ سکتی ہوں۔“

اتنا کہہ کر وہ روتی ہوئی' دوڑتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ وہ گہری سنجیدگی سے اسے دور جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”واہ رے بڈھے شیطان.....! اپنے پیچھے اپنا چیلا چھوڑ گیا ہے۔ لیکن میں بھی تیرا ہی بیٹا ہوں۔“

پھر وہ اس راستے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس جانے والی کو واپس بلا کر ہی دم لوں

گا۔ یہ اس بچے کے لئے جذباتی ہو رہی ہے۔ اگر وہ فساد کی جڑ ختم ہو جائے تو یہ کچے دھاگے سے میری طرف کھنچی چلی آئے گی۔“

وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ قابوس نے اس کی محبت میں اب تک شادی نہیں کی تھی۔ چار برسوں کے طویل انتظار کے بعد اسے پالینے کی امید پیدا ہوئی تو ایک نیا مسئلہ اس کا منہ چڑانے لگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بادشاہ اگر اپنے قوانین پر اٹل رہے گا اور انہیں الگ رہنے کا حکم دے گا تو وہ دشالے کو لے کر مقدونیہ سے فرار ہو جائے گا۔

اس نے اپنے طور پر ایک بہت بڑے مسئلے کا حل تلاش کر لیا تھا۔ لیکن دشالے اس کی خوشیوں پر جیسے پانی پھیر کر چلی گئی تھی۔ وہ بڑی نفرت سے اس بچے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور شیطانی فیصلہ کر رہا تھا۔

دوسری طرف فیلقوس الجھا ہوا تھا۔ قابوس کے سلسلے میں اب تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کے ساتھ کیسا روّیہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس جوان کی مخالفت اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ وحشی قبائل میں وہ اپنے خلاف محاذ نہیں بنوانا چاہتا تھا۔ خوب سوچ سمجھ کر کوئی مناسب فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسے وقت یہ خبر ملی کہ دشالے کے ایک سالہ بیٹے کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔

سب ہی حیران تھے کہ ایک ننھے سے بچے کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ اس واقعے نے تمام قبیلے والوں کے درمیان ہلچل مچا دی تھی۔ سب ہی کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ لیکن دشالے خاموش تھی اور اس کی خاموشی قابوس کو بے چین کر رہی تھی۔ وہ اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا مگر تعزیت کرنے والوں کا ایسا تانتا بندھا ہوا تھا کہ موقع نہیں مل رہا تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد وہ اس کے پاس آیا تو دشالے کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ ایک ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ..... میں تو پہلے ہی دن تیرے پاس آنا چاہتا تھا۔ لیکن .....“



وہ بولتے بولتے رک گیا۔ وہ شدید نفرت سے منہ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے سر رکھ کر رونے کے لئے تیرا کاندھا نہیں چاہئے۔ جا... چلا جا یہاں سے.....“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”تُو..... تُو مجھے جانے کو کہہ رہی ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھ سکتا ہوں‘ بیٹے کے صدمے نے تجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں تیرے زخموں پر مرہم رکھوں گا۔ تجھے اتنی محبتیں دوں گا کہ تُو سارے صدمات بھول جائے گی۔“

وہ پلٹ کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”محبت.....؟ کیسی محبت.....؟ تم مرد کبھی محبت نہیں کرتے۔ صرف اپنی ہوس اور اپنی خوشیوں کو پورا کرنے کے لئے ہم عورتوں کو کھلونا بناتے رہتے ہو۔ پہلے تیرے باپ نے اپنی ہوس کی پیاس بجھانے کے لئے میری حسرتوں کا گلا دبا دیا اور اب تُو نے..... تُو نے تو وہ کر دکھایا‘ جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر ٹوہ لینے کے انداز میں پوچھا۔ ”تُو..... کہنا کیا چاہتی ہے؟“

وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہی، جو کوئی نہیں جانتا۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ تجھے میرے بیٹے سے نفرت تھی ناں...؟“

وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”کک... کیا تُو مجھ پر شبہ کر رہی ہے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”شبہ نہیں..... یقین ہے۔“

”ضرور کسی دشمن نے میرے خلاف زہر اگلا ہے۔“

”تُو اسے اپنی خوشیوں میں رکاوٹ سمجھ رہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس رکاوٹ کو دور کرے گا تو یہ دشالے ہمیشہ کے لئے تجھ سے دور ہو جائے گی۔“

وہ تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”ایسا ظلم نہ کر..... میں تیرے بغیر مر جاؤں گا دشالے! میرا یقین کر..... اس معصوم کو میں نے ہلاک نہیں کیا۔“

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ’’اس دل میں تیرے لئے جو جذبات تھے‘ وہ
میرے بیٹے کی لاش کے ساتھ دفن ہو چکے ہیں۔ اب یہاں کوئی دشالے نہیں رہی
ہے۔ صرف ایک ماتم کرتی ہوئی ماں رہ گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ ماں سب کے
سامنے تیرے سنگین جرم کا پردہ چاک کردے‘ یہاں سے چلا جا....‘‘

قابوس سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ دشالے کے تیور بتا رہے تھے
کہ اس نے چوری پکڑ لی ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی ہے کہ اس کے بچے کو اسی
نے ہلاک کیا ہے۔ فی الحال اسے راضی کرنا آسان نہیں ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ وہاں
سے چلا آیا کہ ذرا وقت گزرے گا‘ بیٹے کا زخم بھرے گا تو وہ اسی کی طرف پلٹ کر
آئے گی اور کہاں جائے گی؟ اس بھری دنیا میں قابوس کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔

وہ اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ دشالے کے دل و دماغ میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا
تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور آئندہ کیا کرنے والی ہے؟ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ وہ
دوبارہ اس کے دروازے پر آیا تو اس بار بھی دشالے نے اسے بری طرح مایوس کیا۔
وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ’’دنیا کا کوئی شخص اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن میں تیرے
سامنے اپنا جرم قبول کر رہا ہوں۔ بس اتنا یاد رکھ کہ میں نے جو کیا‘ تجھے پانے کے لئے
کیا۔ ایک بار مجھے معاف کردے۔‘‘

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف سے منہ
پھیرتے ہوئے بولی۔ ’’میں تجھے کیا معافی دوں؟ میں تو خود ہاتھ جوڑے کھڑی
ہوں۔ لیکن میرا بچہ کبھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔‘‘

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ وہ بیزار ہو کر بولا۔ ’’کیا مرنے
والے کا ماتم ہی کرتی رہے گی؟ اپنی اور میری زندگی کے بارے میں سوچ... ہماری
شادی ہوگی تو تیری گود میں پھر سے پھول کھلے گا۔ میں نے تیرا ایک بیٹا چھینا ہے۔
وعدہ کرتا ہوں‘ بیٹوں سے تیری گود بھر دوں گا۔‘‘

وہ شدید نفرت سے بولی۔ ’’دفع ہو جا یہاں سے... میں ایک قاتل کے ساتھ



زندگی نہیں گزار سکتی۔‘‘

وہ اس کی دھتکار سے جھنجلا گیا تھا۔ غصے سے بولا۔ ’’میرے ساتھ زندگی نہیں
گزارے گی تو کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟‘‘

اس نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا لیکن دوسرے روز شاہ فیلقوس کے نام پیغام
بھجوایا کہ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ شاہی محل کے وزیر نے کہا۔ ’’بادشاہ
روز صبح فریادیوں سے ملاقات کرتا ہے۔ تُو اس وقت محل میں آسکتی ہے۔‘‘

چنانچہ وہ دوسری صبح محل میں پہنچ گئی۔ وسیع و عریض دالان میں فریادیوں کی لمبی
قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس قطار میں شامل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے دربار میں بلایا
گیا۔ وہ بادشاہ کے سامنے ادب سے جھکتے ہوئے بولی۔ ’’شاہ مقدونیہ پر دیوتاؤں کا
سایہ رہے... میں دشالے ہوں اور میرا تعلق ایک وحشی قبیلے سے ہے۔‘‘

وہ اس کا نام سن کر چونک گیا ’’دشالے...؟‘‘

پھر ایک ذرا یاد کرتے ہوئے بولا۔ ’’اوہ۔ تو تُو اس جنگجو سپاہی قابوس کی محبوبہ
ہے۔‘‘

وہ سر جھکا کر بولی۔ ’’کبھی تھی۔ مگر اب نہیں ہوں۔‘‘

وہ تعجب سے بولا۔ ’’کمال ہے۔ وہ تو ہر دوسرے تیسرے روز یہاں آکر اپنی اور
تیری شادی کے لئے منتیں کرتا رہتا ہے۔‘‘

’’اگر میرا بچہ نہ مرتا تو شاید میں بھی یہی عرضی لے کر تیرے دربار میں حاضر ہوتی
مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔‘‘

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ’’پہلے
سہاگ لٹ گیا اور اب گود بھی اجڑ گئی ہے۔ اس دنیا میں قابوس کے سوا میرا کوئی نہیں
رہا ہے۔ میں تیرے قانون کے خلاف اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر کسی رشتے
کے بغیر اس کے ساتھ رہ بھی نہیں سکتی۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں‘ وہ میرے حصول سے
باز نہیں آئے گا۔‘‘

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ بادشاہ پر یہ بھید نہیں کھولنا چاہتی تھی کہ وہ محبوب اس کے معصوم بچے کا قاتل ہے۔ نہ جانے یہ کیسا جذبہ تھا کہ وہ اس سے بدظن ہونے کے باوجود اس کی زندگی چاہتی تھی۔ اگر بادشاہ کو اس کے قاتل ہونے کی ایک ذرا بھنک بھی مل جاتی تو وہ فوراً ہی اسے گرفتار کرنے اور موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دے دیتا۔ جبکہ دشالے نے اس کے لئے یہ سزا تجویز کی تھی کہ جن خوشیوں کی خاطر قائوس نے اس کے بیٹے کو قتل کیا' وہ کبھی ان خوشیوں کو اس کی جھولی میں نہیں ڈالے گی۔ وہ زندہ رہے گا اور ہمیشہ اس کے حصول کے لئے ترستا رہے گا۔

اس نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ ''سوچتی ہوں' اس سے دور ہو جاؤں لیکن میرا کوئی دوسرا ایسا ٹھکانہ نہیں ہے' جہاں قائوس نہ پہنچ سکے۔ تیرے اس محل کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ کیا مجھ دکھیاری کو یہاں پناہ مل سکتی ہے؟ میں کنیز بن کر رہوں گی۔ شاہی خاندان کی خدمت کرتے کرتے ساری زندگی گزار دوں گی۔''

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ غور کرتا رہا۔ پھر تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ''محل کی بے شمار کنیزوں میں ایک کنیز کا اضافہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تجھے یہاں پناہ مل سکتی ہے۔''

بادشاہ کے حکم کے مطابق اسے اولمپیاس کی کنیزوں میں شامل کر دیا گیا۔ فیلقوس نے شاہی محل میں بیگمات کے لئے مختلف اصول بنا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شدید ضرورت کے بغیر بیگمات ایک دوسرے سے ملاقات نہیں کریں گی۔ ایک بیگم کو دوسری بیگم سے کوئی کام ہوتا تو وہ اپنی کنیز کو پیغامبر بنا کر سوکن کی خوابگاہ میں بھیجتی تھی۔ اس طرح ایک ہی چار دیواری میں رہنے کے باوجود ان کے درمیان پیغام رسانی کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

جہاں عورتیں ہوں' وہاں سازشیں نہ ہوں... ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا اور وہ تو پھر سوکنیں تھیں۔ ایک دوسرے کی مصروفیات کے بارے میں جاننے کے لئے اپنی کنیزوں کو جاسوسہ بنائے رکھتی تھیں۔ ایسے میں راز دار بننے والیوں کی خوب چاندی ہوتی تھی۔



بادشاہ نے اب تک کسی بھی بیگم کو اولمپیاس سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ خود بھی اس کی خوابگاہ میں کم ہی جاتا تھا۔ جب دشالے کو اس کے پاس بھیجا گیا تو وہ اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے بولی۔ ''ہوں۔ تو اب شاہ فیلقوس کو جنگلی گلاب اچھے لگنے لگے ہیں؟''

دشالے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ اس کے اردگرد چکر کاٹتے ہوئے بولی۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی کہ فیلقوس کی زندگی میں میرے بعد اور کوئی نہیں آئے گی۔''

اس نے جلدی سے کہا۔ ''تُو غلط سمجھ رہی ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''اچھا... تو پھر تُو ہی سمجھا دے۔ وہ تجھے کس رشتے کے تحت جنگل سے اٹھا کر اس محل میں لے آیا ہے؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''ہمارے درمیان رعایا اور بادشاہ کا رشتہ ہے۔ اس اَن داتا نے میری مدد کی ہے۔ مجھ دکھیاری کو سہارا دیا ہے۔''

''امر بیل کو سہارا دو تو وہ سہارا بننے والے سے لپٹ جاتی ہے۔ اگر تُو ایسا کچھ سوچ کر آئی ہے تو یاد رکھ...! میں تیری جڑیں کاٹ ڈالوں گی۔''

اسے اولمپیاس کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ وہ اس کی سوچ کو بدل نہیں سکتی تھی۔ اس لئے چپ چاپ سر جھکا کر اس کی خدمت میں دن رات گزارنے لگی۔ ایک اولمپیاس ہی کیا... رفتہ رفتہ دشالے اور شاہ فیلقوس کے متعلق محل بھر میں چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں۔

دوسری طرف آرسی نوئی اپنی نئی سوکن کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے لئے بے چین تھی۔ اس سے ملاقات کرنا چاہتی تھی لیکن فیلقوس ہر بار ٹال جاتا تھا۔ وہ اس کی اجازت کے بغیر اولمپیاس سے کلام تو کیا سلام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آخر اس نے اپنی ایک راز دار کنیز کو جاسوسہ بنا کر اس کی خوابگاہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

کنیز نے کہا۔ ''بلا ضرورت وہاں جاؤں گی تو وہ شبہ کرے گی اور یہ خبر بادشاہ تک پہنچ گئی تو وہ میری کھال کھنچوا دے گا۔''

"کیا مجھے نادان سمجھتی ہے؟ میں شاہی محل کے اصولوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اپنے نام سے کوئی پیغام نہیں بھجوا سکتی۔ شاہ فیلقوس میری جان کو آجائے گا۔"

"تو پھر میں کس بہانے سے وہاں جاؤں گی؟"

"تجھے ایک ناٹک کرنا ہوگا۔"

"کیسا ناٹک...؟"

وہ اسے لوہے کا چمٹی نما ایک آنکڑا دکھاتے ہوئے بولی۔ "اس آنکڑے سے اپنی پنڈلی پر زخم لگا۔"

وہ ہچکچانے لگی۔ آرسی نے کہا۔ "تھوڑی تکلیف تو ہوگی لیکن میں تجھے جھولی بھر کے انعام دوں گی۔"

"لیکن یہ زخم لگانے کا مقصد...؟"

وہ اس آنکڑے کے دونوں سروں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ "یہ تیری پنڈلی پر جو نشان چھوڑے گا وہ بالکل ایسا ہوگا' جیسے تجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ تُو اولمپیاس کے پاس اس کے زہر کا توڑ کروانے جائے گی۔"

یہ ناٹک تکلیف دہ تھا۔ لیکن انعام کے لالچ نے اس تکلیف کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔ وہ کنیز آرسی نوئی کے مشورے کے مطابق پنڈلی پر زخم لگا کر روتی بلبلاتی ہوئی اولمپیاس کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کی کنیزوں کو اپنا زخم دکھاتے ہوئے بولی۔ "ہائے... مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ مجھے اولمپیاس کے پاس لے چلو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ ہائے... میرے جسم میں زہر پھیل رہا ہے۔"

کنیزیں اس کے زخم کو دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ اس کی آہ و بکا سن کر اولمپیاس نے اسے اندر آنے کا حکم دیا۔ وہ دو کنیزوں کے سہارے اندر آکر فرش پر لیٹ گئی۔ وہ ہائے ہائے کرتی جا رہی تھی اور چور نظروں سے اس خوابگاہ کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اولمپیاس ایک چھوٹے سے ڈبے کو کھول کر اس میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ کنیز کی نظر اس کے پالتو سانپوں پر پڑی تو وہ چیخ کر بولی۔ "ہائے میں مر گئی۔ اتنے سارے



سانپ....؟ ضرور انہی میں سے کسی نے مجھے کاٹا ہے۔"

ایک کنیز نے کہا۔ "آرام سے لیٹی رہ۔ یہ سانپ اس پٹارے میں بند رہتے ہیں، کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔"

اس نے انجان بنتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔ "مگر انہیں یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟"

اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "کیا تجھے نہیں معلوم....؟ اولمپیاس کو سانپوں سے عشق ہے۔ یہ دن بھر ان سے کھیلتی رہتی ہے۔"

وہ مزید کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اولمپیاس کو اس طرف آتا دیکھ کر چپ ہوگئی۔ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ قریب آکر بولی۔ "سانپ کا ڈسا ہوا پانی بھی نہیں مانگتا اور تُو پٹر پٹر باتیں بنا رہی ہے۔"

وہ چور سی ہو کر بولی۔ "نہیں۔ وہ میں تو... ہائے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

وہ اس کے زخم کو ایک ذرا لاپروائی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تُو نے سانپ کو کاٹتے ہوئے دیکھا تھا؟"

وہ کنیز بڑی شاطر تھی۔ اولمپیاس کے تیور دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ اس سے یہ ناٹک چھپ نہیں سکے گا۔ وہ فوراً ہی پینترا بدلتے ہوئے بولی۔ "نہیں۔ میں نے کسی سانپ کو نہیں دیکھا۔ لیکن... یہ زخم ایسا لگ رہا ہے جیسے..."

"یہ تیرا وہم ہے، تجھے کسی سانپ نے نہیں کاٹا ہے۔ چل اٹھ اور جا یہاں سے۔"

وہ اطمینان ظاہر کرتی ہوئی وہاں سے باہر آگئی۔ اولمپیاس کی اس کنیز سے مزید یہ معلومات بھی حاصل ہوئیں کہ دیوتا زیوس کی وہ پجارن بہت ہی عجیب عورت ہے۔ بچپن سے زہریلے سانپوں کے درمیان رہتی آئی ہے۔ اس لئے خود بھی ایسی زہریلی ہوگئی ہے کہ کوئی زہر اس پر اثر نہیں کرتا ہے۔

یہ تمام تفصیلات حیران کن تھیں۔ اس کنیز نے یہ تمام معلومات آرسی نوئی تک پہنچائیں تو وہ اپنی سوکن کے بارے میں حیرانی اور بے یقینی سے سوچنے لگی۔ اولمپیاس

کی شخصیت کسی پراسرار جادوگرنی کی طرح حواسوں پر چھانے لگی تھی۔

فیلقوس کی زیادہ تر راتیں آرسی نوئی کے ساتھ ہی گزرتی تھیں۔ اس رات وہ کمرے میں آیا تو اس نے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی' اولمپیاس آئے گی تو تُو میری خوابگاہ کا راستہ بھول جائے گا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے زیرِلب مسکراتا رہا۔ وہ اسے جام پیش کرتے ہوئے بولی۔ ''تجھے اس عورت سے ڈر نہیں لگتا؟''

وہ ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بولا۔ ''کیوں...؟''

وہ بولی۔ ''میں نے سنا ہے' وہ سانپوں کے درمیان رہتے رہتے خود بھی زہریلی ہوگئی ہے۔''

وہ جام کو خالی کر کے اسے دوبارہ بھرنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا پتہ سانپ اس کے ساتھ رہتے رہتے زہریلے ہوگئے ہیں؟''

وہ اسے دوسرا جام پیش کرتے ہوئے مسکرانے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''تُو اس سے خوش نہیں ہے؟''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''مجھے اس کے سانپوں سے نفرت ہے۔ خوابگاہ کے خوابناک سے ماحول میں وہ رینگتے ہوئے کیڑے ایک ذرا اچھے نہیں لگتے۔ پھر دوسری طرف دیوتا زیوس کا وہ مجسمہ.....اُونہہ....''

وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''اولمپیاس کے کمرے کو خوابگاہ نہیں کہا جاسکتا۔''

وہ ایک ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''اسے محل میں آئے کئی دن گزر گئے ہیں۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں ہے۔ میں اس سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ بیزار ہو کر بولا۔ ''میں جب بھی تیرے پاس آتا ہوں' تُو اس کا ذکر شروع کر دیتی ہے۔''

وہ اسے تیسرا جام پیش کرتے ہوئے بولی۔ ''دراصل اس کی شخصیت کے بارے



میں اتنا سن چکی ہوں کہ اس سے ملنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔''

آخر اس رات وہ بادشاہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ وہ اسے اولمپیاس سے ملاقات کی اجازت دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ بہت گھمنڈی عورت ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں' تُو ایک کے بعد دوسری بار ملاقات کی خواہش نہیں کرے گی۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی بات سن کر زیرِلب مسکرانے لگی۔ مسکراہٹوں کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ محبت سے مسکراؤ تو وہ شاعرانہ اور قاتلانہ ہوتی ہے۔ نفرت سے مسکراؤ تو وہ ہلاکت خیز بن جاتی ہے۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ وہ مسکراہٹ کیا رنگ لائے گی؟

❁........❁........❁

دشالے کو محل میں گئے ہوئے پانچ روز گزر گئے تھے۔ اس کی ایسی طویل غیر حاضری نے قابُوس کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا' اسے واپس لانا چاہتا تھا۔ لیکن محل کی طرف جانے سے کترا رہا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ دشالے نے بادشاہ کو یہ حقیقت بتا دی ہوگی کہ وہ اس کے بچے کا قاتل ہے۔ وہ سزا کے ڈر سے روپوش ہوگیا تھا۔ جب پانچ روز گزر جانے کے بعد اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تو یہ اطمینان ہوا کہ دشالے نے اپنی زبان نہیں کھولی ہے۔

اس کے اس روّیے سے قابُوس کو حوصلہ مل رہا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ اس وسیع و عریض محل کی چار دیواری میں چھپنے والی نے اس کی محبت سے منہ نہیں موڑا ہے۔ اس نے سوچا۔ ''مجھے لگتا ہے' وہ بادشاہ کے پاس میری اور اپنی شادی کا مطالبہ لے کر گئی ہوگی۔ لیکن اس خر دماغ فیلقوس نے اسے قیدی بنا لیا ہے۔ مجھے اس کی بازیابی کے لئے محل میں جانا چاہئے۔''

چنانچہ وہ دوسری صبح محل میں پہنچ گیا۔ بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر دشالے کا مطالبہ کیا تو وہ بولا۔ ''وہ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے۔ اپنی مرضی سے جائے گی۔

میں تیرے کہنے پر اسے محل سے نہیں نکال سکتا اور پھر تیرا اس سے رشتہ کیا ہے؟''

''سب جانتے ہیں۔ تُو بھی جانتا ہے' میں اس کا ہونے والا شوہر ہوں۔''

''لیکن وہ میرے قانون کے مطابق تجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''وہ مجھ سے شادی کرے یا نہ کرے' یہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال میں اسے لینے آیا ہوں۔''

''وہ تیرے ساتھ نہیں جائے گی۔''

''کیوں نہیں جائے گی؟''

''کیونکہ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس محل میں بہت خوش ہے۔''

اس نے گھور کر اسے دیکھا۔ پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ اس کی محبوبہ بادشاہ کے قبضے میں تھی۔ وہ اس سے تلخ کلامی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''میں دشالے سے ملنا چاہتا ہوں۔''

قابُوس کو یہ شبہ بھی ہو رہا تھا کہ کہیں دشالے کو قتل نہ کروا دیا گیا ہو؟ حاکم وقت سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ یہ اپنے رائج کردہ قانون کا جھنڈا اونچا رکھنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے اطمینان کے لئے دشالے کو بلایا گیا تو شبہ یکسر ختم ہو گیا۔ اس نے ایک نظر قابُوس پر ڈالی پھر سر جھکا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

بادشاہ نے کہا۔ ''یہ تجھے لینے آیا ہے۔ کیا تُو اس کے ساتھ جانا چاہے گی؟''

وہ تھوڑی دیر تک زمین کو گھورتی رہی۔ قابُوس کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ بادشاہ کے سوال پر انکار میں سر ہلا دیا۔

قابُوس نے تڑپ کر کہا۔ ''دشالے...! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ پہلے کچھ بتائے بغیر محل میں آ کر بیٹھ گئی اور اب واپس جانے سے انکار کر رہی ہے؟''

اس نے ایک ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''میں واپس جانے کے لئے نہیں آئی ہوں۔ یہ شاہ فیلقوس کی دریا دلی ہے کہ اس نے مجھے محل میں جگہ دے دی۔ ورنہ....''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ پھر ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''تُو یہاں سے



چلا جا۔ اس چار دیواری کے باہر میرا کسی سے کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔''

پھر اس سے پہلے کہ وہ جواباً کچھ کہتا۔ وہ پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاہ فیلقوس نے کہا۔ ''تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ دشالے کو عقل آ گئی ہے۔ تُو بھی ہوش کے ناخن لے اور کسی دوسری عورت سے شادی کر لے۔''

وہ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ بادشاہ کو گرم مزاجی دکھائے گا تو وہ ابھی اسی وقت اسے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دے گا۔ بہتر یہی تھا کہ محل سے نکل کر اس کے خلاف محاذ آرائی کی جائے۔ اس نے بادشاہ کو کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا۔

بہت پرانا فقرہ ہے' لیکن ایسے موقع پر یہی کہا جاتا ہے کہ خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر جانے والا اپنے قبیلے میں پہنچ کر پھٹ پڑا۔ لوگوں کو بادشاہ کے خلاف ورغلاتے ہوئے بولا۔ ''تم سب شاہ فیلقوس کی بہت تعریفیں کرتے ہو۔ جاؤ... جا کر دیکھو... اس لنگڑے محسن نے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے؟ ہمارے قبیلے کی عورت کو قیدی بنا کر وہ ہماری غیرت کے منہ پر جوتے مار رہا ہے۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''لیکن میں نے تو سنا ہے' دشالے اپنی مرضی سے محل میں گئی تھی؟''

''ہاں۔ گئی تھی۔ لیکن اپنی مرضی سے واپس نہ آ سکی۔ شاہ فیلقوس نے اسے محل میں نظر بند کر دیا ہے۔''

اس کی ایسی باتیں قبیلے کے دوسرے جوانوں کو طیش میں مبتلا کر رہی تھیں۔ ایک بزرگ نے کہا۔ ''آخر بادشاہ ایسا کیوں کرے گا؟''

وہ بولا۔ ''تا کہ میں اس کے قانون کے خلاف دشالے سے شادی نہ کر سکوں۔ وہ یہی فریاد لے کر اس کے پاس گئی تھی۔ نادان تھی' سمجھ رہی تھی' رو دھو کر' اس کی منت سماجت کر کے اس خود سر بادشاہ کو قائل کر لے گی۔ مگر....''

وہ غصے سے دانت پیسنے لگا۔ ایک نوجوان نے کہا۔ ”اپنا حکم منوانے کے لئے شاہ مقدونیہ نے بہت ہی گھٹیا راستہ اختیار کیا ہے۔“

ایک جوشیلے نوجوان نے کہا۔ ”وہاں دشالے کی عزت کو خطرہ ہے۔ ہمیں ابھی بادشاہ کے پاس جا کر اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہئے۔“

ایک بزرگ نے اِن نوجوانوں کے تیور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ فیلقوس نے دشالے کو اپنے محل میں رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ مگر اس پر کسی بھی طرح کا شبہ کرنا سراسر نادانی ہوگی۔“

ایک نوجوان نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”تُو تو ایسے بول رہا ہے‘ جیسے شاہ فیلقوس کے مزاج سے واقف ہی نہ ہو۔ سب جانتے ہیں‘ وہ عورتوں کا رسیا ہے۔ کنیزوں اور داسیوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ دشالے کے معاملے میں اس پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟“

سب ہی اس جوان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ قابوس نے ایک ننھی سی چنگاری دکھائی تھی اور وہ چنگاری دیکھتے ہی دیکھتے بھڑک کر شعلہ بن رہی تھی۔ ایک نوجوان نے قبیلے کے بزرگوں سے کہا۔ ”سوچ کیا رہے ہو؟ عزت پر بات آئی ہے۔ ہم چپ نہیں بیٹھیں گے۔ ابھی اسی وقت محل میں جا کر دشالے کو واپس لائیں گے۔“

ایک بزرگ نے کہا۔ ”دشالے کو محل سے لانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ تم سب آرام سے بیٹھو۔ ہم قبیلے کے پنچوں کے ساتھ بادشاہ کے پاس جائیں گے۔“

قابوس جانتا تھا کہ دشالے اس سے دور رہنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اس قاتل محبوب سے بدظن ہوگئی ہے۔ اب قبیلے کا سرپنچ بھی اس کی مرضی کے خلاف اسے واپس نہیں لا سکے گا۔ جب وہ تمام بزرگ محل کی طرف روانہ ہوئے تو قابوس اپنے ساتھیوں کو بھڑکانے لگا۔ انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرنے لگا کہ شاہ فیلقوس نے دشالے کو بُری طرح ڈرا دھمکا کر قیدی بنا رکھا ہے۔ اس کے منہ میں بادشاہ کی زبان رکھ دی گئی ہے۔ وہ بے چاری یہی کہتی ہے کہ اپنی مرضی سے اس محل میں زندگی گزار



رہی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

آخر وہی ہوا‘ جس کے بارے میں وہ پہلے پیشگوئی کر چکا تھا۔ جوشیلے نوجوان غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔ اپنے بزرگوں کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ قابوس نے کہا۔ ”دیکھا....! میں نے کہا تھا نا....وہ اسے واپس نہیں بھیجے گا؟“

قبیلے کے سرپنچ نے کہا۔ ”یہ بات نہیں ہے۔ وہ اپنی خوشی سے وہاں ملازمت کر رہی ہے۔ بادشاہ نے اس سے ہماری ملاقات کرائی تھی۔ ہم مطمئن ہو کر ہی وہاں سے آئے ہیں۔“

قابوس نے کہا۔ ”تم مطمئن ہو سکتے ہو، لیکن ہم نہیں ہوں گا۔ اس مظلوم کی مجبوری کو سمجھ رہے ہیں۔ وہ بادشاہ کے زیرِ اثر ہے۔ اس لئے اس کی بولی بول رہی ہے۔“

ان وحشی جوانوں کی طرف سے شاہ فیلقوس کے خلاف زبردست محاذ آرائی شروع ہوگئی تھی۔ قریبی دوستوں کی دشمنی دور رہنے والے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ وہ سب ہی مقدونی فوج سے منسلک تھے۔ ان کی کمزوریوں اور شہزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

یہ خبر اولمپیاس کے کانوں تک پہنچی تو اس نے بادشاہ سے کہا۔ ”کیا یہ نادانی نہیں ہے‘ تُو ایک دوکوڑی کی عورت کی خاطر بغاوت کی آگ کو ہوا دے رہا ہے؟“

وہ ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ محل کے چکنے فرش پر شاہانہ ترتیب سے چلنے والے پاؤں کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس لنگڑے کی بے ترتیب چال سے کھٹ کھٹا کھٹ کی بے ڈھنگی آواز پیدا ہوتی تھی۔ اسے دیکھے بغیر دور ہی سے سمجھ لیا جاتا تھا کہ فیلقوس آ رہا ہے۔ وہ اس کے پیروں کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میرے پاس کنیزوں کی کمی نہیں ہے۔ اس فتنہ کار کو فوراً یہاں سے روانہ کر دے۔“

دشالے خوابگاہ کے دوسرے حصے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کی باتیں سن

رہی تھی۔فیلقوس نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔''یہی تو پریشانی ہے۔وہ یہاں رہے یا اپنے قبیلے میں...فساد تو ہونا ہی ہے۔میں ایک بیٹے کو اس کی سوتیلی ماں سے شادی کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں؟اگر بغاوت سے بچنے کے لئے ایک کو اجازت دوں گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ آئندہ بھی ایسی غیر مذہبی اور غیر قانونی شادیاں ہوتی رہیں گی۔ان کے اس دستور کو جڑ سے ختم کرنا ضروری ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔''کیا داشتائیں رکھنا اور دنیا دکھاوے کے لئے ان سے نام نہاد شادیاں کرنا غیر مذہبی اور غیر قانونی فعل نہیں ہے؟''

اس نے تیور بدل کر پوچھا۔''تُو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

''تجھے سمجھانا چاہتی ہوں کہ جب ایک حکمران اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق ملک کے قانون کو توڑ مروڑ سکتا ہے تو پھر اپنے امن و امان کی خاطر اسے عارضی طور پر اپنے قانون میں لچک پیدا کرنا چاہئے۔''

وہ اسے گہری سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔دوسری طرف دشالے شرمندہ سی ہو رہی تھی۔وہ مدد کرنے والا' اسے پناہ دینے والا اس کی وجہ سے پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہو گیا تھا اور ان پریشانیوں کو دور کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ قابوس کے پاس چلی جائے۔جبکہ وہ اس کی صورت بھی دیکھنا گوارہ نہیں کر رہی تھی۔اسے دیکھتی تھی تو اپنے معصوم مقتول بچے کا چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگتا تھا۔

وہ بری طرح الجھ گئی تھی۔تھوڑی دیر تک سوچتی رہی' ہر پہلو پر غور کرتی رہی۔پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اولمپیاس کی اجازت سے بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر بولی۔''تیری پریشانیاں ختم کرنے کے لئے قابوس سے ملاقات ضروری ہو گئی ہے۔میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ٹھیک ہے۔اسے آج شام محل میں بلایا جائے گا۔''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔''محل میں نہیں....میں شام کے بعد جھیل کنارے



اس سے ملاقات کے لئے جانا چاہتی ہوں۔''

دشالے کا یہ پیغام فوراً ہی قابوس تک پہنچا دیا گیا۔وہ دیوانہ خوشی سے جھوم اٹھا۔مقررہ وقت سے پہلے ہی مطلوبہ مقام پر آ کر بیٹھ گیا۔شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ایسے وقت دشالے کی آہٹ سنائی دی۔وہ چھوٹے بڑے پتھروں پر چلتی ہوئی اس سے ذرا فاصلے پر آ کر رک گئی۔وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔''مجھے یقین تھا' میری دیوانگی آخر کار تجھے موم بنا ہی دے گی۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ ذرا اور قریب آ کر بولا۔''میں اپنے کئے پر بہت شرمندہ ہوں۔تُو نے مجھ سے بدظن ہونے کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی ہے۔تیرے اس احسان نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔کاش...!میں نے اس معصوم کی جان نہ لی ہوتی۔''

دشالے کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔اس نے صدمے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔''سچ کہتے ہیں' محبت اندھی ہوتی ہے۔تُو نے مجھ سے محبت کی اور اس اندھے پن میں میرے بچے کو مار ڈالا۔ممتا بھی اندھی ہوتی ہے۔اپنی گود اجاڑنے والے کو کبھی بسنے نہیں دیتی۔''

قابوس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔وہ بولی۔''اتنی زندگی گزارنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ میرے نصیب میں خوشیاں نہیں ہیں اور جہاں خوشیاں نہ ہوں' وہاں ماتم ہوتا ہے۔میں ایسی ماتمی زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔اس لئے مرجانا چاہتی ہوں۔''

وہ تڑپ کر بولا۔''ایسی مایوسی کی باتیں نہ کر۔میں تجھے خوشیاں دوں گا۔''

وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔''ایک مرنے والا بھلا کسی کو کیا خوشی دے سکتا ہے؟''

پھر اس سے پہلے کہ قابوس اس کے ارادوں کو سمجھتا، اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔دشالے نے ایک تیز دھار خنجر اس کے پیٹ میں اتار دیا تھا۔وہ دیدے

پھیلائے حیرانی اور بے یقینی سے کبھی اسے اور کبھی اس خنجر کو دیکھ رہا تھا۔ دشالے نے اس ہتھیار کو ایک جھٹکے سے باہر کھینچا پھر دوسری بار اس کے سینے میں اُتار دیا۔ وہ تکلیف سے کراہتا ہوا پتھریلی زمین پر گر پڑا۔

وہ حقارت سے بولی۔ ''مجھے تو مرنا ہی ہے لیکن تیری موت بھی ضروری تھی۔ تُو زندہ رہتا تو میری موت کے بعد شاہ فیلقوس کے خلاف یہ فساد پھیلاتا کہ دشالے نے بادشاہ کی وجہ سے خودکشی کر لی ہے۔ تُو نے بغاوت کی جو آگ بھڑکائی ہے' اسے تیرے لہو سے بجھانا ضروری تھا۔''

یہ کہتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے وہ خنجر اپنے سینے میں اتار لیا۔ قابوس زمین پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ وہ بھی وہیں گر پڑی۔ دو چاہنے والے آخری وقت میں ایک دوسرے کے قریب تھے۔ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ شکایتی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ قابوس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ''ہم ایک خوش و خرم زندگی گزار سکتے تھے۔ تُو بچّے کے بغیر جی سکتی تھی۔''

دشالے کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ''میں بچّے کے بغیر آدھی مر چکی تھی اور تیرے بغیر جی بھی نہیں سکتی تھی۔ ہمارا حساب اسی طرح برابر ہونا تھا' سو ہو گیا.....''

وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ دشالے کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جھیل کے پتھروں پر اس کی آنکھیں بھی پتھرا کر رہ گئی تھیں۔

===❋===



فیلقوس نے اطمینان کی سانس لی۔ دشالے اس پر بہت بڑا احسان کر گئی تھی۔ اس نے اپنی جان دے کر اور قابوس کی جان لے کر بغاوت کی آگ ٹھنڈی کر دی تھی۔ جو کام وہ تخت پر بیٹھ کر نہ کر سکا تھا' وہ دشالے نے محبت اور نفرت کے سنگم پر کر دکھایا تھا۔

آرسی نوئی اولمپیاس سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ اس نے دوسرے ہی دن اسے پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ اولمپیاس شاہ فیلقوس کی کسی بھی بیگم سے راہ و رسم بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ انہیں بیگمات کا درجہ ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ ان سے الگ تھلگ رہ کر اپنی اہمیت جتانا چاہتی تھی۔ اس نے آرسی نوئی کا بہت چرچا سنا تھا۔ یہ خبریں بھی ملتی رہتی تھیں کہ بادشاہ کی زیادہ تر راتیں اسی بیگم کے پہلو میں گزرتی ہیں۔

جب آرسی نوئی کی طرف سے پیغام موصول ہوا تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی صرف اس لئے حامی بھری کہ وہ اپنی اس سوکن کو دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیسی ساحرہ ہے' جس کے جادو کا توڑ وہ بھی نہیں کر پائی ہے؟

آرسی نوئی وقت مقررہ پر اس کی خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ وہ اسے ایک ذرا رُکھائی سے خوش آمدید کہتے ہوئے بولی۔ ''تیری آمد کا شکریہ.....''

وہ دونوں ہی گہری نظروں سے ایک دوسری کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آرسی نوئی

نے کہا۔ ''اصولاً تجھے میرے پاس آنا چاہئے تھا۔ کیونکہ میں تجھ سے پہلے اس محل میں آئی تھی۔ اس لئے رتبے میں تجھ سے بڑی ہوں۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''ہاں۔ میں نے سنا ہے' یہ محل شاہ فیلقوس کی داشتاؤں سے بھرا پڑا ہے۔''

اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اولمپیاس کو گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ''اگر تُو پچھلی تمام بیگمات کو فیلقوس کی داشتائیں سمجھتی ہے تو انہوں نے بادشاہ کے کئی بچوں کو جنم دیا ہے۔ تُو ان بچوں کو کیا کہے گی؟''

اولمپیاس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آرسی نے کہا۔ ''تُو بیگمات کی اہمیت گراتے ہوئے یہ بھول گئی کہ دراصل فیلقوس پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔''

وہ بولی۔ ''چور دروازے سے آنے والیوں کو بیگمات کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ تُو بھی تو رات کے اندھیرے میں سب سے چھپ کر یہاں آئی تھی۔''

''میں آئی نہیں تھی۔ لائی گئی تھی۔ شاہ فیلقوس مجھے اپنانے کے لئے خود چل کر میرے دروازے تک آیا تھا۔''

وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ ''یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بکاؤ مال کو خریدنے کے لئے خریدار کو دکان تک جانا ہی پڑتا ہے۔''

آرسی نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ تیرا ہاتھ مانگنے کے لئے بھی تیرے باپ کے دروازے پر گیا تھا۔''

اس نے جل بھن کر جواب دیا۔ ''رشتہ داری اور زنا کاری میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''کچھ زیادہ بھی نہیں ہوتا۔ تُو یہاں آنے سے پہلے بادشاہ سے منسوب ہوگئی تھی اور میں یہاں آنے کے بعد.... جو چیز خریدنے سے پہلے آزمالی جائے' وہ دل سے نہیں اترتی۔ لیکن جسے خریدنے کے بعد آزمایا جائے' اس کی خامیاں بھی بعد میں ہی نظر آتی ہیں۔ بادشاہ نے مجھے ٹھونک بجا کر اپنایا ہے اور یہ سب ہی دیکھ رہے ہیں کہ



میں آج بھی اس کی منظورِ نظر ہوں۔''

''کیا تُو یہاں اپنی برتری جتانے آئی ہے؟ یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں خامیوں سے بھری ہوئی ہوں؟''

''اگر تیرے اندر کوئی کمی نہیں ہے تو پھر تُو ہی بتا' شاہ فیلقوس نئی والی کو چھوڑ کر پرانی والی کے پاس کیوں کھنچا آتا ہے؟''

''کسی خوش فہمی میں مت رہنا آرسی نوئی! یہ شاہوں کا مزاج ہوتا ہے۔ وہ اپنی داشتاؤں کو مفت کی روٹیاں توڑنے نہیں دیتے۔ اسی لئے انہیں استعمال میں رکھتے ہیں۔''

''اگر شاہوں کی بیگمات داشتائیں کہلاتی ہیں تو تیری حیثیت بھی ہم جیسی ہی ہے۔ تُو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ حکمران کی بیٹی ہے۔ مگر افسوس...! ملکہ کا تاج تیرے سر کی بھی زینت نہ بن سکا۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ حقارت سے منہ پھیر کر یوں کھڑی ہوگئی جیسے زبان بے زبانی سے آرسی نوئی کو جانے کا اشارہ کر رہی ہو۔ وہ مسکراتی ہوئی سر جھٹک کر اس کی خوابگاہ سے جانے لگی۔ پھر دروازے پر رکتے ہوئے بولی۔ ''شاہ فیلقوس درست کہتا ہے' ان سانپوں نے نہیں... تیرے غرور نے تجھے زہریلا بنا رکھا ہے۔''

اس نے پلٹ کر اسے گھورا۔ وہ مسکراتی ہوئی دروازے سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اولمپیاس شاہ فیلقوس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ اس سے دور ہو جانے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کی پہلی رات سے خود کو ملکہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن بادشاہ نے یہ کہہ کر اس کے اعتماد کی دھجیاں اڑا دی تھیں کہ جو اس کے دل کی ملکہ بنے گی' وہی مقدونیہ کی ملکہ کہلائے گی۔ اس کی اس بات سے واضح ہوگیا تھا کہ وہ حسن و جمال اور خاندانی وقار کا خزانہ لئے پھرنے والی اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود بادشاہ کی ایک عام سی بیگم ہے۔

وہ اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ ایسی مایوسی کے باوجود دوسری بیگمات پر اپنی

برتری قائم رکھنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا وہ اپنی کنیزوں کو سانپوں اور دیوتا زیوس کے حوالے سے مافوق الفطرت قصے سناتی رہتی تھی۔ اپنے آس پاس کے ماحول پر گہری نظر رکھتی تھی۔ بڑی ذہانت سے غور وفکر کرنے کے بعد پیشگوئی بھی کرتی تھی جو سچ ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی ایسی حکمت عملی اور مکاریوں نے اسے پراسرار مالکہ بنادیا تھا۔

کچھ عرصے بعد ہی محل میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ آرسی نوئی کے پاؤں بھاری ہو گئے ہیں۔ اس خبر کے ساتھ ہی اولمپیاس کے دل میں کھد بد ہونے لگی۔ یہ سوچ سوچ کر پریشان رہنے لگی کہ آرسی نوئی شاہ فیلقوس کی چہیتی ہے۔ اگر اس نے پہلا بیٹا پیدا کیا تو کیا اسے مقدونیہ کا ولی عہد بنایا جائے گا؟

جو سوال اولمپیاس کو پریشان کر رہا تھا' وہی سوال آرسی نوئی کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ اس نے شاہ فیلقوس سے کہا۔ ''میں نے ملکہ بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تُو بازار سے لائی گئی ہے۔ خاندانی وقار کے پیشِ نظر تجھے ملکہ نہیں بنایا جا سکتا۔ تُو نے اپنی اوقات سمجھ لی۔ یہ اچھی بات ہے۔''

وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اب یہ آنے والا مہمان مجھے خواب دکھا رہا ہے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''تُو نے مجھے اپنی ملکہ نہیں بنایا۔ لیکن اس بچے کو اپنا ولی عہد بنا سکتا ہے۔''

''کمال ہے۔ ابھی دائی نے بتایا نہیں اور تجھے پہلے ہی خبر ہو گئی کہ بیٹا پیدا ہو گا؟''

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''اور اگر بیٹا ہی پیدا ہوا تو....؟''

وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی بات سن کر سنجیدہ ہو گیا۔ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لے۔ ولی عہد اسے بنایا جاتا ہے جس کی ماں کا تعلق شاہی خاندان سے ہو۔''



آرسی نوئی کے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے وہ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کو چھو کر کہہ رہا تھا۔ ''میں مجبور ہوں۔ شاہی خاندان کے اس دستور کو بدل نہیں سکتا۔''

وہ تھوڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''اور اگر شاہی خاندان کی کوئی عورت ایک وارث کو جنم نہ دے سکے تو....؟''

''تو مجبوراً کسی دوسری بیگم کے بیٹے کو ولی عہد بنایا جاتا ہے۔''

فیلقوس کی بات سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ دوسری طرف اولمپیاس بھی اپنے طور پر سوچ بچار میں مصروف تھی۔ یہ تو جانتی تھی کہ ایک طوائف کے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا جائے گا' مگر شاہ فیلقوس کا کیا بھروسہ....؟ وہ الٹے دماغ کا آدمی تھا۔ اس کی حکمت عملیاں بڑی عجیب ہوتی تھیں۔ وہ ملکہ بننے کے سلسلے میں دھوکا کھا چکی تھی۔ لیکن ولی عہد کے معاملے میں کوئی دھوکا کھانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ وہ ایک طوائف کے بیٹے کو ولی عہد بنا سکتا ہے یا نہیں؟ اس نے ایک رات اس بارے میں فیلقوس سے پوچھا تھا۔ لیکن وہ اس معاملے کو ٹالتا رہا تھا۔

اولمپیاس کی ماں نے کہا۔ ''ولی عہد کا معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ سوکن بیٹا پیدا کرے گی یا بیٹی....؟''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''جب میں نے محل میں قدم رکھا تو میرا خیال تھا کہ بادشاہ مجھے ملکہ بنا کر رکھے گا۔ لیکن.... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کڑوی حقیقت سامنے آتی چلی گئی کہ ملکہ کی جگہ ابھی خالی ہے۔ پتہ نہیں' وہ انجانی سوکن کون ہو گی' جو اس جگہ کو پُر کرے گی؟ مجھے میرا حق نہ مل سکا مگر میں اپنے بچے کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گی۔ آرسی نوئی ہو یا وہ نئی آنے والی ملکہ... میں کسی سوکن کے بیٹے کو ولی عہد بننے نہیں دوں گی۔ یہ میری ضد ہے....''

اس نے اس سلسلے میں دیوتا زیوس کے مندر کے ایک کاہن کی خدمات حاصل کیں۔ اسے بڑی رازداری سے یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے علم کے ذریعہ آرسی نوئی کے

بارے میں بتائے کہ وہ بیٹا پیدا کرے گی یا بیٹی...؟ وہ کاہن جو بھی پیشگوئی کرنے والا تھا' اسے اولمپیاس اپنی علمی قابلیت سے منسوب کرکے سب پر یہی ظاہر کرنے والی تھی کہ آرسی نوئی کے حوالے سے اسے آگہی حاصل ہوئی ہے۔

وہ اس مندر کی خاص پجارن تھی۔ دیوتا زیوس کی خدمت میں وقتاً فوقتاً قیمتی چڑھاوے چڑھاتی رہتی تھی۔ اس کی ایسی سخاوت سے وہاں کے پروہتوں اور کاہنوں کی چاندی ہوتی رہتی تھی۔ وہ کاہن کسی کے سامنے یہ راز اگلنے والا نہیں تھا کہ اولمپیاس نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔

تین روز بعد اس کاہن کی طرف سے یہ کہانت موصول ہوئی کہ اولاد کے حوالے سے اگلے دو برس فیلقوس کے لئے بہت خوش آئند ہیں۔ اس عرصے میں اس کی جو بھی بیوی حاملہ ہوگی' وہ بیٹا ہی پیدا کرے گی۔ آرسی نوئی بھی ایک بیٹے کی ماں بننے والی ہے۔

اس رات فیلقوس اپنی ایک دوسری بیگم کی خوابگاہ میں پہنچا ہوا تھا۔ ایسے وقت ایک خادمہ نے آکر کہا۔ ''اولمپیاس نے شاہ مقدونیہ کو یاد کیا ہے۔''

وہ فوراً ہی اس بیگم کے پہلو سے اٹھ کر اس کی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے دیوتا زیوس کے مجسمے کے سامنے دو زانو بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ فیلقوس اس سے ذرا دور رکھی ہوئی تپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تُو نے مجھے بلایا ہے؟''

وہ پڑھتے پڑھتے رک گئی۔ مجسمے کے قدموں میں سجدہ کرنے کے بعد سیدھی بیٹھ گئی۔ سر گھما کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں... تجھے ایک خوشخبری سنانی ہے۔''

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ دیوتا کے مجسمے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''جو بات ابھی آرسی نوئی کی دائی کو بھی نہیں معلوم' وہ بات دیوتا زیوس نے مجھے بتا دی ہے۔ تیری اس بیوی کے بیٹا ہونے والا ہے۔''

وہ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سنا ہے' تُو درست پیشگوئی کرتی



ہے۔''

''یہ دیوتا زیوس کی مہربانیاں ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر زیرِ لب مسکراتا ہوا وہاں سے اٹھ کر خوابگاہ سے باہر چلا گیا۔ اس کا ایسا رویہ اولمپیاس کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے اسے متاثر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے پیش گوئی سن کر کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کا ایک ذرا سا جھکاؤ اولمپیاس کو غرور کے ساتویں آسمان پر پہنچا دے گا۔ اس لئے وہ اس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔ اولمپیاس کی خودسری اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ دوسری طرف وہ رفتہ رفتہ اس سے ایسی بدظن ہو رہی تھی۔ اس کی ہر اچھی بری بات اسے خار کی طرح کھٹکنے لگی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ وہ دونوں دنیاوی دکھاوے کے لئے ازدواجی رشتہ نباہ رہے تھے۔ جبکہ اندر ہی اندر ایک دوسرے کے بدترین مخالف بنتے جا رہے تھے۔

اولمپیاس کی پیشگوئی جلد ہی آرسی نوئی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ اسے ایک بیٹے کی بشارت ملی تھی۔ وہ مسرتوں سے نہال ہو رہی تھی۔ اس کی وفادار کنیز نے کہا۔ ''ایسے خوشی کے موقع پر یہ مت بھول کہ کوئی عورت اپنی سوکن کی سہیلی نہیں ہوتی۔ وہ غیب کی باتیں جاننے والی' بیٹے کی خوشخبری سنانے والی تجھے نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔''

اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ''تجھے اس سوکن سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ ایک بیٹے کی پیشگوئی تیرے لئے خوشخبری ہو سکتی ہے مگر اولمپیاس کے لئے نہیں... بھلا وہ کیوں چاہے گی کہ اس کی سوکن ایک وارث پیدا کرے؟''

اولمپیاس کی غیر معمولی شخصیت سب ہی کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں کنیز کی باتوں نے آرسی نوئی کو پریشان کر دیا تھا۔ اسے دن رات یہ اندیشہ ڈسنے لگا تھا کہ وہ غیب کی باتیں جاننے والی پیدائش سے پہلے ہی اس کے بچے کی جان نہ لے

لے... آئندہ نو مہینوں تک وہ ایسے ہی اندیشوں میں مبتلا رہنے والی تھی۔

❁.........❁.........❁
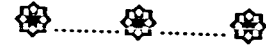
نو ماہ بعد آرسی نوئی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس دوران اولمپیاس کے پاؤں بھی بھاری ہو گئے تھے۔ آرسی نوئی بیٹے کی پیدائش پر جشن منانا چاہتی تھی۔ شاہ فیلقوس نے کہا۔ ''دو مہینوں کی بات ہے' اولمپیاس بھی زچگی سے فارغ ہونے والی ہے۔ دونوں بچوں کی خوشی ایک ساتھ منائی جائے گی۔''

وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ لیکن مصلحتاً خاموش رہی۔ یہ جانتی تھی کہ اس کی نہیں سنی جائے گی۔ بادشاہ کے اس فیصلے نے اسے مایوس کیا تھا۔ وہ اس سے دور دور رہنے لگی تھی۔ یہ احساس دل میں کچوکے لگاتا رہتا تھا کہ پیدا ہونے والے سے زیادہ اسے اہمیت دی جا رہی ہے، جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔

اس کاہن کی کہانت کے مطابق دو ماہ بعد اولمپیاس نے بھی ایک بیٹے کو جنم دیا۔ یوں شاہ فیلقوس یکے بعد دیگرے دو بیٹوں کا باپ بن گیا۔ جشن کے موقع پر اس نے دونوں بچوں کو گود میں اٹھا کر چومتے ہوئے کہا۔ ''دنیا کے ہر باپ کو ایک وقت میں ایک بازو نصیب ہوتا ہے۔ لیکن مجھے بیک وقت دو بازو مل گئے ہیں۔''

وہ جشن کے دوران ان بچوں کو گود میں لئے بیٹھا ہوا تھا۔ اولمپیاس ابھی سے اپنے بیٹے کی برتری جتانا چاہتی تھی۔ اسے بادشاہ کی گود سے لیتے ہوئے بولی۔ ''ایک داشتہ اور بیگم کے بچوں میں فاصلہ رہنا چاہئے۔''

اس نے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ آرسی کے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا جائے گا۔ مگر یہ دونوں ایک باپ کا لہو ہیں۔ اس لئے ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے۔''

آرسی سے پیدا ہونے والے بچے کا نام بطلیموس رکھا گیا اور اولمپیاس کے بیٹے کا نام سکندر تجویز کیا گیا۔ ایک بوڑھے کاہن نے ننھے سکندر کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اولمپیاس سے کہا۔ ''میرا علم کہتا ہے' تیرا یہ بچہ بہت بھاگوان ہے۔ آنے والے وقت میں فتوحات کے جھنڈے گاڑتا رہے گا۔ میں نے اس کی پیدائش کے وقت



مشرق کے افق پر بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھے ہیں۔''

اولمپیاس نے خوش ہو کر بیٹے کو دیکھا۔ پھر کاہن سے کہا۔ ''مشرق کے افق پر شعلے بھڑکنے کا مطلب کیا ہوا؟''

وہ بولا۔ ''آنے والا وقت سارے بھید کھول دے گا۔''

وہ کہانت ذرا الجھی ہوئی تھی۔ لیکن سکندر کی خوش قدمی پہلی بار یوں ظاہر ہوئی کہ جس رات وہ پیدا ہوا اس کے دوسرے روز فیلقوس کا ایک گھوڑا اولمپیائی کھیلوں میں اول نمبر پر آیا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد اس کاہن کی کہانت بھی واضح ہو گئی۔ فیلقوس کو خبر ملی کہ سکندر کی ولادت کی رات ایشیا کے ساحل پر افی سوس میں آرٹی مس کا مندر نذر آتش کیا گیا ہے۔

یہ تمام خوشخبریاں سکندر سے منسوب کی جا رہی تھیں۔ ایسے میں اولمپیاس کے پاؤں غرور سے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے فیلقوس کے گھوڑوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بادشاہ کا یہ شوق اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ لیکن بیٹے کے حوالے سے گھوڑے کی جیت کا پرزور جشن منایا گیا۔ پیلا میں نیلگوں جھیل کے بعد سب سے خوبصورت مقام گھڑ دوڑ کا میدان تھا، جسے اولمپیاس طنزیہ انداز میں گھوڑوں کا اصطبل کہتی تھی۔

شاہ فیلقوس نے آرسی نوئی سے وعدہ کیا تھا کہ دونوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ ان کے تمام اساتذہ یکساں ہوں گے لہٰذا سکندر کی طرح بطلیموس کی پرورش بھی شہزادوں کی طرح کی جا رہی تھی۔ عمر کے چودھویں برس میں انہیں عسکری تربیت دی جانے لگی۔ جب استاد کے حکم سے دونوں بھائیوں کے درمیان شمشیر زنی ہوتی تھی تو ان کی مائیں اپنے اپنے دل تھام کر بیٹھ جاتی تھیں۔ بطلیموس سکندر کے مقابلے میں پھرتیلا اور چالاک تھا۔ مشق کے دوران بجلی کی سی تیزی میں پینترے بدلنا خوب جانتا تھا۔

جبکہ سکندر کو ہتھیاروں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے دو ہی شوق

تھے۔ایک تو وہ کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا۔ ہر وقت شاہی مطالعہ گاہ میں کتابی کیڑا بنا رہتا تھا۔ ہرقل ابن ذی اوس کے قدیم ضمیمے بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ ہرقل ایک بہت ہی ماہر تیر انداز تھا۔اس نڈر اور بے باک جانباز نے دور دراز کے کئی علاقے فتح کئے تھے۔ وہ شیر کی کھال کا نقاب پہنتا تھا۔سکندر نے اس کے بارے میں اتنا پڑھا تھا کہ ہرقل کی شخصیت اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔

سکندر کا دوسرا شوق گھڑ سواری تھا۔ اس کے اس شوق سے اولمپیاس بری طرح چڑتی تھی۔اس کی کوشش ہوتی تھی کہ بیٹا کتابوں اور گھوڑوں کی دنیا سے نکل کر سپاہ گری میں کمال حاصل کرے۔ایسے وقت فیلقوس مسکرا کر کہتا تھا۔ ''گھڑ سواری اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ بیٹا اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔تُو کیوں اپنا خون جلاتی رہتی ہے؟''

دن رات کتابوں کی دنیا میں گم رہنے اور گھڑ سواری کرتے رہنے کے باعث سکندر کے بدن میں وہ پھرتی نہیں رہی تھی' جو کسی بھی جنگجو سپاہی کا خاصہ ہوتی ہے۔جب وہ سیدھا کھڑا ہوتا تھا تو اس کا سر ایک ذرا سا دائیں طرف جھکا رہتا تھا۔مشق کے لئے اکھاڑے میں آتا تھا تو اس کی ہتھیلیاں اور پیروں کے تلوے پسینے سے بھیگ جاتے تھے۔اولمپیاس اپنی سوکن کے بیٹے سے اس کا موازنہ کرتی رہتی تھی۔بطلیموس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فن سپاہ گری میں کمال حاصل کرتا جا رہا تھا۔ تیر اکی کے مقابلوں میں بھی وہی اوّل نمبر پر آتا تھا۔بس دوڑ کا میدان ایسا تھا' جہاں بطلیموس اسے شکست نہیں دے پاتا تھا۔لہٰذا اس نے اپنی ناکامیوں سے جل کر اس کا نام بھگوڑا سکندر رکھ دیا تھا۔

اولمپیاس جب بھی بیٹے کو کتابوں میں مگن دیکھتی تو فوراً ہی اسے سمجھانے پہنچ جاتی۔اس روز بھی وہ حسب معمول ہرقل کے ایک بوسیدہ ضمیمہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اولمپیاس نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔''یہ قدیم مُشاہیر تیرے کام نہیں آئیں گے۔تُو شاہ فیلقوس کا ولی عہد ہے۔آئندہ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے والا ہے۔دنیا



میں آج تک کسی بادشاہ نے ہاتھ میں کتاب لے کر حکومت نہیں کی ہے۔''

''جانتا ہوں۔مگر کیا کروں؟ مجھے یہ کتابیں اچھی لگتی ہیں۔''

اس نے ایک ذرا بیزاری سے بیٹے کو دیکھا۔ پھر کہا۔''تُو ہرقل کے بارے میں پڑھتا ہے۔اس سے متاثر ہے۔ پھر اس کی طرح فن سپاہ گری میں کمال حاصل کیوں نہیں کرتا؟ وہ جنگجو اپنی انہی صلاحیتوں کے باعث نڈر اور بے باک کہلاتا ہے۔کیا تُو مشہور ہونا نہیں چاہتا؟ آج تُو اس کے کارنامے پڑھ کر متاثر ہوتا رہتا ہے۔کیا آئندہ اپنی صلاحیتوں سے دنیا کو متاثر نہیں کرنا چاہے گا؟''

ماں کی بات سن کر وہ ایک ذرا ٹھٹک گیا۔ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔''میں تجھے گھڑ سواری سے اور کتابیں پڑھنے سے نہیں روکوں گی۔لیکن ماں کی بات مان... عسکری تربیت میں دل لگا۔ جب تُو شمشیر زنی میں یا تیر اکی کے مقابلے میں بطلیموس سے ہارتا ہے تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔صرف دوڑ کے میدان میں جیتنا تیری کامیابی نہیں ہے۔''

وہ ہرقل کا ایک قدیم نوشتہ اٹھاتے ہوئے بولی۔''میں چاہتی ہوں' آئندہ آنے والی نسلیں میرے بیٹے کے کارناموں کو پڑھتی رہیں۔''

اس نے ایک نظر سکندر پر ڈالی۔وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔وہ نوشتہ کو ایک طرف رکھ کر چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔ پھر یہی ہونے لگا۔اسے جب بھی موقع ملتا وہ ہرقل کا حوالہ دے کر بیٹے کو فن سپاہ گری کی طرف مائل کرنے لگتی تھی۔ اس کی ایسی حکمت عملی جیسے سکندر کے اندر ایک نئی روح پھونکتی جا رہی تھی۔

بطلیموس ایسی ماہرانہ چالاکی سے لڑتا تھا کہ سکندر کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ مشق کے دوران جب نگران سپاہی موجود نہ ہوتا تو وہ بڑی مکاری سے پینترا بدل کر سکندر پر ایسا وار کرتا تھا کہ وہ زخمی ہو جاتا تھا۔

اس روز وہ حسب معمول مشق میں مصروف تھے۔نگران سپاہی مطمئن ہو کر ایک درخت کے سائے میں لیٹا ہوا تھا۔کبھی کبھی سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ

دونوں اپنے اپنے بائیں ہاتھ میں چرمی ڈھال تھامے شمشیر زنی کی مشقیں کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے وار سے بچنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایسے وقت سکندر کے دل و دماغ میں اولمپیاس کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ''شہزور فاتح وہی ہوتا ہے' جس کی تلوار کا ہر وار اپنے دشمن کے وجود پر پڑتا ہے نہ کہ اس کی ڈھال پر.....''

سکندر کے وجود میں جیسے بجلی سی بھر گئی تھی۔ وہ اپنی تلوار کو بڑی تیزی سے حرکت دے رہا تھا۔ اس کے ایسے انداز سے بطلیموس بوکھلا گیا تھا۔ نتیجتاً اس کی ڈھال ٹوٹ گئی اور تلوار کی حرکت سے بے چارگی ٹپکنے لگی۔ اس کے برعکس سکندر پر وہ گرمجوشی طاری تھی' جو شکاری کو اپنے شکار کے قریب پہنچ جانے پر ہوتی ہے۔ اس کے تیور دیکھ کر بطلیموس گھبرا گیا۔ اس نے ایک ذرا سر گھما کر نگران سپاہی کو دیکھا۔ وہ درخت کے سائے میں مزے سے ستا رہا تھا۔ بطلیموس نے سکندر کے وار سے بچتے ہوئے اسے پکارا۔ ''میری ڈھال ٹوٹ گئی ہے۔ اس وحشی کو فوراً روکا جائے۔''

نگران سپاہی ایکدم سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ تیزی سے ان کے قریب آ کر اپنا نیزہ ان کی تلواروں کے درمیان پھنساتے ہوئے بولا۔ ''رک جا اے سکندر...! رک جا....!''

سپاہی کی آواز سن کر اس کا جنون ایک ذرا کم ہوا۔ بطلیموس اپنی تلوار پھینک کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چہرے سے پسینے کو پونچھتے ہوئے سکندر کو گھور رہا تھا۔ نگران سپاہی نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ اسے فوراً طبی امداد دی جائے اور خود سکندر کا ہاتھ تھام کر اسے فیلقوس کے پاس لے آیا۔ اولمپیاس بھی وہاں موجود تھی۔

سپاہی نے مشق کرنے کا احوال بتاتے ہوئے بادشاہ سے کہا۔ ''سکندر کی ایسی شعلہ مزاجی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

اولمپیاس بیٹے کا کارنامہ سن کر متاثر ہو رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔ خوشی سے چہک کر بولی۔ ''شاباش میرے بیٹے...! دشمن پر آندھی طوفان کی طرح ہی



وار کرنا چاہئے۔ تا کہ اسے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے۔''

فیلقوس نے بیگم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''وہ دشمن نہیں...اس کا بھائی ہے اور مشق کے دوران اسے اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی؟''

اولمپیاس نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔ سکندر نے کہا۔ ''میں اسے زخمی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں' مجھے کیا ہو گیا تھا؟''

سپاہی نے کہا۔ ''میں نے اکثر دیکھا ہے' مشق کے دوران اسے پسینہ بہت آتا ہے۔ یہ بوکھلایا ہوا سا رہتا ہے۔ بالکل ایسے جنوبی گھوڑوں کی طرح جنہیں رتھ میں جوتنے کے لئے ساز سے آراستہ کیا جاتا ہے تو وہ بے قابو ہوتے رہتے ہیں۔''

اولمپیاس نے ناگواری سے سپاہی کو دیکھا۔ فیلقوس نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ اوصاف اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملے ہیں۔''

اولمپیاس جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت آرسی نوئی اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ بادشاہ کو اس کے زخم دکھاتے ہوئے بولی۔ ''سکندر نے میرے بیٹے سے نہ جانے کونسی دشمنی نکالی ہے؟ لہولہان کر کے رکھ دیا ہے۔ آئندہ یہ اس کے ساتھ مشق نہیں کرے گا۔''

اولمپیاس نے ایک ذرا طنزیہ انداز میں بطلیموس پر نظر ڈالی۔ وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے سکندر کو گھور رہا تھا۔ اس کے بگڑے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ سکندر اس وقت وہاں تنہا ہوتا تو وہ ابھی اس پر حملہ کر بیٹھتا۔

بادشاہ نے آرسی نوئی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تلواروں کے سائے میں کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو زخم لگتے ہی ہیں۔ تجھے شکایت نہیں کرنی چاہئے۔ اس طرح بچوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے میل پیدا ہو گا۔''

آرسی اس کی اس بات پر تلملا کر رہ گئی۔ اس واقعہ کے بعد سکندر اور بطلیموس کے درمیان ایک ذرا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود بادشاہ کے حکم کے مطابق ان کی مشترکہ تعلیم و تربیت اور عسکری مشقیں جاری رکھی گئیں۔

❁.........❁.........❁
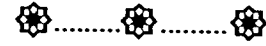
شاہ فیلقوس کی نظریں یونان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی حکمت عملی سے اس پر قبضہ جمانا چاہتا تھا، ان دنوں ایتھنز کی باگ ڈور ڈیماس تھینز کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ فیلقوس کے ارادوں سے باخبر تھا۔ اسی لئے اس کا زبردست مخالف بن گیا تھا۔ ملک بھر میں اس کے خلاف تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ اہل ایتھنز کو زورِ خطابت سے فیلقوس کے خلاف اکساتا رہتا تھا۔ ہر بچے اور محبِ وطن شہری کو مشورے دیتا تھا۔ ''فوج میں بھرتی ہو جاؤ... ایتھنز کی جمہوریت کو بچانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

فتوحات اور ملک گیری کی یہ ہوس فیلقوس اور ڈیماس تھینز کے بیچ نہیں تھی۔ بلکہ دو متضاد نظریوں کے درمیان تھی۔ ڈیماس تھینز آزاد شہری ریاستوں کا نظریہ رکھتا تھا اور جمہوریت کا حامی تھا۔ اسی لئے یونان میں جمہوری حکومت قائم کی گئی تھی اور یونانی یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہاں فرد واحد کی بادشاہت رائج کی جائے۔ جبکہ فیلقوس کا نظریہ بادشاہت تھا۔

ڈیماس تھینز کی تقریریں اور خطبے فیلقوس تک پہنچتے رہتے تھے۔ وہ مسکرا کر سنتا تھا اور ان خطبات کو شاہی مطالعہ گاہ میں محفوظ کر لیتا تھا۔ اس نے شاہ مقدونیہ کے خلاف جو بھی خطبے دیئے۔ انہیں ''فیلقوسیات'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ڈیماس تھینز صرف فیلقوس کی ذات کو نشانہ نہیں بناتا تھا، بلکہ وہ فیلقوسی قوت کے احیا کا دشمن تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ ''بادشاہت کا جو سکہ شاہ مقدونیہ نے رائج کیا ہے' وہ اس کے ساتھ فنا نہیں ہوگا۔ ایک فیلقوس ختم ہوگا تو اس کی جگہ نیا فیلقوس آجائے گا۔ لہٰذا اس نسل در نسل چلنے والی بادشاہت کو یکسر ختم کرنے کے لئے ایک زبردست جمہوری فوج کی ضرورت ہے۔''

اس روز فیلقوس سکندر کے ساتھ مطالعہ گاہ میں بیٹھا ہوا تھا اور بیٹے کی زبانی اس کے دل پسند جنگجو ہرقل ابن ذی اوس کے قصے سن رہا تھا۔ پھر ایک خطبہ اسے تھماتے ہوئے بولا۔ ''لو... ذرا اسے سناؤ۔''



سکندر نے وہ خطبہ دیکھا تو وہاں ڈیماس تھینز کا نام پڑھ کر چونک گیا۔ فیلقوس شاہانہ مسند کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''چونک کیوں گئے؟ پڑھو....''

وہ باپ کے حکم پر اس خطبے کو پڑھنے لگا۔ سکندر خطیب کے پرشکوہ اور ولولہ انگیز فقرے سن کر متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے ایتھنز کے شہریوں کو فیلقوس کے خلاف اکساتے ہوئے کہا تھا۔ ''اے لوگو! ہتھیار سنبھال لو اور اس یک چشم بادشاہ کے آگے سر جھکانے کے بجائے اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے جانیں دے دو۔ میں فیلقوس کو اپنے ملک کا دشمن سمجھتا ہوں۔ وہ بڑی حکمت عملی سے اور گہری سازشوں کے ذریعہ ہم پر قابض ہونا چاہتا ہے۔''

اہل ایتھنز فیلقوس سے اور اس کی فوجی قوت سے خوفزدہ تھے۔ ڈیماس تھینز نے اپنے ہم وطنوں کے ایسے خوف کو بڑی حقارت سے نظر انداز کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''فیلقوس کو بہت بڑا ماہر حربیات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کی حیثیت ایک بھیڑیئے کی سی ہے....''

سکندر پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ نظریں اٹھا کر باپ کو دیکھا۔ وہ شاہی مسند پر پاؤں پسارے تازہ انگوروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک بڑا سا خوشہ اٹھا کر انگور توڑ توڑ کر کھاتے ہوئے بولا۔ ''تُو آج تک اپنے باپ کی تعریفیں سنتا رہا ہے۔ لیکن تعریف کرنے والے حمایتی ہوتے ہیں۔ تُو مستقبل کا ولی عہد ہے۔ میں تجھے سمجھانا چاہتا ہوں کہ ایک حکمران کو اپنے حمایتیوں کی نہیں... ہمیشہ اپنے مخالفین کی باتیں سننی چاہئیں۔ خطبہ جاری رکھ....''

وہ آگے پڑھنے لگا۔ ''وہ بھیڑیا جو انسانوں سے چھپ چھپا کر لاشوں سے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ کہا جاتا ہے' فیلقوس بہت خوبصورت ہے۔ لیکن کیا تم دیکھتے نہیں.... عورتیں بھی تو خوبصورت ہوتی ہیں۔ سنا ہے' وہ شراب بہت پیتا ہے۔ میری نظر میں یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ ایک ننھی جونک بھی ڈھیروں خون چوس لیتی ہے....

محبِ وطن یونانیوں کے لئے دیوتاؤں نے نیک شگون پیش کر دیئے ہیں۔ پیتھیا کے مندر سے یہ کہانت موصول ہوئی ہے کہ بہت جلد آسمانی عقاب فضاؤں میں اڑتے ہوئے دیکھیں گے کہ مفتوح گریہ وزاری میں مبتلا ہے اور فاتح موت کے گھاٹ اتر رہا ہے۔ یقیناً اس پیشگوئی کا مطلب یہی ہے کہ اہلِ مقدونیہ فیلقوس کا ماتم کریں گے، جو آئندہ جنگ میں قطعی طور پر ہلاک ہونے والا ہے۔''

وہ خطبہ اختتام پذیر ہوا۔ مطالعہ گاہ کی خاموش فضا میں سکندر کی نگاہیں فیلقوس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اگر چہ ڈیماس کا وہ خطبہ باپ کے خلاف تھا، لیکن سکندر اس کی باتوں سے اور فقروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ انگوروں کا خوشہ کسی خزاں رسیدہ جھاڑی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ فیلقوس اسے ایک طرف پھینک کر تالی بجاتے ہوئے بولا۔ ''واہ... کیا خطبہ پڑھا ہے؟ ڈیماس تھینز کی یاد تازہ کر دی۔''

اس نے ایک ذرا توقف سے پوچھا۔ ''کیا تجھے یہ خطبہ پسند آیا؟''

سکندر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔ بہت زبردست ہے۔ مگر افسوس...! یہ سارا زہر تیرے خلاف اگلا گیا ہے۔''

''بے شک۔ ڈیماس تھینز میرے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ وہ ہمارے زمانے کا ہرقل ہے۔ وہ شہری ریاستوں کی خرابیوں کا علاج ایک اعلیٰ نصب العین کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے' بادشاہت نہیں ہونی چاہئے۔ اُونہہ بے وقوف..... اس کے اس نصب العین کو عوامی حکومت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ ڈیماس تھینز کی جمہوریت ہے۔''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ زیرِ لب مسکرانے لگا۔ سکندر بڑی خاموشی سے اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر کہا۔ ''وہ بولتا خوب ہے۔ ایسے خطیب کو یونانی زبان میں زعیم کہتے ہیں۔''

پھر وہ ایک طرف رکھے ہوئے خطوط کے پلندے کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرے نزدیک یہ خطبہ اتنا ہی موثر ہے' جتنا کہ فوج کے ایک سپہ سالار کی تقریر موثر ہوتی ہے جو سپاہیوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیتی ہے۔''



وہ پلندے میں سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب ذرا اسے پڑھ کر سنا...''

وہ اس کاغذ کو لے کر اس کا عنوان پڑھتے ہوئے بولا۔ ''فیلقوس کی جانب سے ڈیماس تھینز کے نام...؟''

وہ ایک اور خوشہ اٹھا کر انگور توڑ توڑ کر کھاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تُو نے جو خطبہ پڑھا۔ یہ اس کا جواب ہے۔''

وہ اس خط کو پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔ ''اے جمہوریت کے حامی...! شاہ فیلقوس تجھے مقدونیہ میں خوش آمدید کہتا ہے۔ تیرا جب دل چاہے' پیلا چلا آ۔ میں وعدہ کرتا ہوں' ہماری یہ ملاقات بہت ہی اچھے ماحول میں ہوگی۔ تیری تسلی کے لئے میں اس بات کا بھی ذمہ اٹھاتا ہوں کہ تجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر بہ حفاظت واپس بھیج دیا جائے گا۔''

یہ مختصر سی تحریر اگر چہ ایک محرر کی تھی۔ لیکن بات فیلقوس کی تھی۔ سکندر اسے پڑھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی... اس خط میں فیلقوس اپنے دشمن کو بڑی فراخ دلی سے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک زہر اگلنے والے دشمن کے لئے اتنی مٹھاس...؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی....؟''

وہ نشست سے اٹھ کر سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''ایک بات گرہ سے باندھ لے' انسان کو صرف زہر ہلاک نہیں کرتا۔ مٹھاس بھی مار ڈالتی ہے۔''

وہ ایک ذرا الجھ سا گیا۔ وہ قریب آ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں' تُو اس وقت الجھ رہا ہے۔ کوئی بات نہیں.... رفتہ رفتہ میری حکمتِ عملی کو سمجھنے لگے گا اور تجھے سمجھنا ہی ہوگا۔ کیونکہ تُو سلطنت مقدونیہ کا ولی عہد ہے۔ میرا جانشین ہے۔''

سکندر تائید میں سر ہلا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔

''ویسے ڈیماس تھینز نے اس خط کا جواب کیا دیا....؟''

فیلقوس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔''وہ یہاں آیا تھا۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔''کیا واقعی...؟ تُو نے بلایا اور وہ چلا آیا....؟''

''اسے اپنے خطبوں پر بھروسہ تھا اور مجھے اپنی حکمت عملی پر... جب وہ یہاں آیا تو میں نے اس کا پُرزور استقبال کیا۔ اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ڈیماس کو اور اس کے حامیوں کو ایسی عزت افزائی کی توقع نہیں تھی۔ اُونہہ.....''

اس نے سر جھٹک کر کہا۔''بے چارہ...! بُری طرح بوکھلا گیا تھا۔ میرے خلاف بہت کچھ بولنے آیا تھا۔ لیکن میری مہمان نوازی کی مٹھاس نے اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔''

وہ متاثر ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔''میں نے سنا ہے' اہل یونان تعلیمی میدان میں ہم سے کئی قدم آگے ہیں؟''

''ہاں۔ اسی لئے وہ بے وقوف تدبیر کے بجائے اپنی تحریر سے یونانیوں کی تقدیر بدلنا چاہتا ہے۔''

اس بات پر وہ دونوں ہی ہنسنے لگے۔ ایسے وقت بطلیموس دروازے سے کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اندر وہ ہنس رہے تھے اور باہر وہ غصے سے تلملا رہا تھا۔ باپ کی ایک بات دماغ میں گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے سکندر سے کہا تھا۔ ''میں جانتا ہوں' تُو اس وقت الجھ رہا ہے۔ کوئی بات نہیں.... رفتہ رفتہ میری حکمت عملیوں کو سمجھنے لگے گا اور تجھے سمجھنا ہی ہوگا۔ کیونکہ تُو سلطنت مقدونیہ کا ولی عہد ہے۔ میرا جانشین ہے۔''

بطلیموس نے دروازے کی اوٹ سے گھور کر سکندر کو دیکھا۔ پھر شدید ناگواری سے سر جھٹک کر وہاں سے پلٹ گیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا آرسی نوئی کی خوابگاہ میں پہنچا تو پتہ چلا' وہ تازہ ہوا کے لئے پائیں باغ میں گئی ہوئی ہے۔ وہ فوراً ہی خوابگاہ سے نکل کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ وہ اس کے بگڑے



ہوئے تیور دیکھ کر بولی۔''کیا بات ہے؟ کیا سکندر سے پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''

وہ پھنکارنے کے انداز میں بولا۔''جھگڑا؟ اُونہہ.... یہ ٹھیک ہے کہ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے۔ ہماری مائیں الگ ہیں لیکن باپ تو ایک ہے۔ پھر... پھر ہر معاملے میں اسے مجھ پر فوقیت کیوں دی جاتی ہے؟''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔''آخر بات کیا ہے؟''

وہ اسے شانوں سے تھام کر بولا۔''یہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر کیا بات ہے' ایک باپ کی اولاد ہونے کے باوجود وہ مجھ سے برتر کیوں ہے؟ اور صرف وہی نہیں... اس کی وہ خودسر گھمنڈی ماں بھی پورے محل کی حکمران بنی پھرتی ہے۔ جبکہ تجھے اس سے پہلے اس محل میں لایا گیا تھا۔ تیرا درجہ اس سے بلند ہے۔''

آرسی نوئی اپنے بیٹے سے یہ حقیقت چھپاتی رہی تھی کہ وہ طوائف زادی ہے۔ بطلیموس یہ تو جانتا تھا کہ اس کی ماں کا تعلق حکمران خاندان سے نہیں ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ فیلقوس کی بیوی بننے سے پہلے وہ بدنام زمانہ کوچے میں زندگی گزارتی رہی ہے۔ اس کے سینکڑوں چاہنے والے اس کے لئے آہیں بھرتے تھے۔ فیلقوس بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ پہلے اس کی داشتہ رہی تھی۔ پھر بیوی بنی تھی۔

وہ خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ بیٹے کے سوالوں کا کیا جواب دے؟ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔''یہ ٹھیک ہے کہ تیرا تعلق کسی حکمران خاندان سے نہیں ہے۔ لیکن اولاد کا نام تو باپ کے شجرے سے چلتا ہے۔ میں فیلقوس کا بیٹا ہوں۔ عمر میں سکندر سے بڑا ہوں۔ اس لحاظ سے جانشینی میرے حصے میں آنی چاہئے۔ لیکن اس سوتیلے کو ولی عہد بنایا جارہا ہے۔''

اس نے چونک کر پوچھا۔''یہ تجھے کس نے کہا....؟''

وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔''یہ تو میں بچپن سے سنتا آرہا ہوں اور ہمیشہ اس کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑاتا رہا ہوں۔ لیکن.... آج فیلقوس کی زبان سے سن کر یقین ہو چلا ہے' اس سوتیلے کو ہی ولی عہد بنایا جائے گا۔''

اولمپیاس اپنی کنیزوں کے ہمراہ پائیں باغ کی طرف آ رہی تھی۔ ماں بیٹے کی باتیں سن کر راہداری میں ہی کھڑی ہوگئی۔ آرسی نوئی کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔ ''سکندر کی ولی عہدی کا فیصلہ اس کے بچپن میں ہی کر دیا گیا تھا۔''

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''آخر کیوں...؟ اس میں ایسے کونسے سُرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں، جو مجھے دکھائی نہیں دیتے؟''

''وہ پَر تجھے کبھی دکھائی نہیں دیں گے۔''

اولمپیاس کی آواز سن کر وہ دونوں ہی چونک گئے۔ وہ ایک ایک قدم چلتی ہوئی ان کے قریب آ کر رک گئی۔ بطلیموس نے ناگواری سے کہا۔ ''آج معلوم ہوا کہ شاہی خاندان کی خواتین چھپ کر دوسروں کی باتیں سنتی رہتی ہیں؟''

''صرف سنتی نہیں ہیں...سناتی بھی ہیں۔''

وہ جل کر بولا۔ ''تیری اس خوبی کا ہمیں خوب اندازہ ہے۔''

وہ اسے نظر انداز کر کے آرسی نوئی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''تیرے بیٹے نے تجھ سے کئی سوال پوچھے۔ لیکن تُو نے سوائے ایک کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اسے ولی عہد کیوں نہیں بنایا جا رہا ہے' جبکہ یہ عمر میں سکندر سے بڑا ہے؟''

پھر وہ بطلیموس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تُو نہیں دیکھتا کہ فیلقوس کے اور بھی کئی بیٹے ہیں' جو عمر میں تجھ سے بڑے ہیں۔ اگر جانشینی کا تعلق عمر سے ہوتا تو ضرور ان میں سے کسی کو ولی عہد بنایا جاتا۔ لیکن یہ برتری صرف سکندر کو حاصل ہو رہی ہے۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''وہ فیلقوس کی نام نہاد بیگمات کے نام نہاد بیٹے ہیں۔ میں ان کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میرے اور سکندر کے معاملے میں ان کا ذکر کہاں سے آ گیا؟''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''ان کا ذکر تو بہت ضروری ہے۔ کیونکہ تیری بات انہی میں آتی ہے۔''



اس نے ایکدم سے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ آرسی نوئی نے جلدی سے کہا۔ ''اولمپیاس! میرا خیال ہے' تجھے ہم ماں بیٹے کے معاملے میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔''

پھر وہ بیٹے کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ ''چلو..ہم اندر چل کر بات کریں گے۔''

وہ اولمپیاس کو گھور رہا تھا۔ ماں کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں سننا چاہتا ہوں۔ آخر یہ کہنا کیا چاہتی ہے؟''

اولمپیاس نے کہا۔ ''ہاں آرسی نوئی! اب یہ بڑا ہو گیا ہے۔ اسے حقیقت بتا دینی چاہئے۔ ورنہ یہ بے چارہ یونہی الجھتا رہے گا۔''

وہ سوالیہ نظروں سے کبھی ماں کو اور کبھی اولمپیاس کو دیکھ رہا تھا۔ آرسی نوئی نے بے بسی سے سر جھکا لیا تھا۔ اولمپیاس نے کہا۔ ''میرے بیٹے کی برتری میری ذات سے وابستہ ہے۔ کیونکہ میرا تعلق حکمران خاندان سے ہے۔ جبکہ تیری ماں.... ماضی کی ایک مشہور طوائف ہے۔''

بطلیموس نے شدید حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''فیلقوس رات کے اندھیرے میں دنیا سے منہ چھپا کر اسے اپنے محل میں لایا تھا۔ اب تُو ہی بتا' بھلا ایک طوائف کے بیٹے کو ولی عہد کیسے بنایا جا سکتا ہے؟''

وہ ماں کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ... یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

آرسی نوئی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ بیٹے سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ منہ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''یہ درست کہہ رہی ہے۔ ہاں... میں ایک طوائف تھی۔ لیکن یہ سلسلہ اسی وقت ختم ہو گیا تھا' جب تیرا باپ مجھے اس محل میں لایا تھا۔''

بطلیموس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اولمپیاس نے اس سے کہا۔ ''سلسلہ تو ختم ہو گیا۔ لیکن داغ نہ دھل سکا اور وہی داغ بیٹے کی زندگی کو داغدار کر رہا ہے۔''

وہ شدید ناگواری سے بولا۔ ''یہ میرے لئے بہت افسوس کی بات ہے کہ میں فیلقوس کی ایک داشتہ کا بیٹا ہوں۔''

آرسی نوئی نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کی ہے۔''

اولمپیاس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''شادیاں کرنا تو اس کا شوق ہے۔ چل... تیری خوشی کے لئے مان لیتی ہوں کہ تُو اس کی بیوی ہے۔ رشتہ کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بطلیموس کو تیرا گھناؤنا پیشہ کمتر بنا رہا ہے اور ہمیشہ بناتا رہے گا۔''

پھر وہ بطلیموس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے' میں نے تیری الجھنیں دور کر دی ہیں۔''

اس نے ایک نظر آرسی نوئی پر ڈالی۔ پھر طنزیہ انداز میں مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ بطلیموس صدمے سے ٹوٹ رہا تھا۔ ماں نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں' تجھے میری حقیقت جان کر بہت صدمہ ہو رہا ہوگا۔''

وہ بولا۔ ''ایک جنگجو سپاہی کی سلامتی کا انحصار ہتھیار سے زیادہ اس کی ڈھال پر ہوتا ہے۔ آج سوتیلوں کے میدان میں میری ڈھال ٹوٹ گئی ہے۔''

وہ تیزی سے پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بیٹے کی مایوسی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اولمپیاس واقعی بڑی زہریلی تھی۔ ایسے ڈس کر گئی تھی کہ اب آرسی نوئی لاکھ جتن کے باوجود اس کے زہر کا توڑ نہیں کر سکتی تھی۔

===✿===



ان دنوں سکندر کے دل و دماغ پر ہومر سوار تھا۔ وہ ہرقل ابن ذی اوس کو بھول کر اس کے نوشتوں میں سر کھپا رہا تھا۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ گھڑ سواری کا شوق بھی عروج کو پہنچ رہا تھا۔ اسے خبر ملی تھی کہ تھسلی سے اعلیٰ نسل کے کئی گھوڑے منگوائے گئے ہیں اور انہیں گھڑ دوڑ کے میدان میں بادشاہ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ان میں سے بہترین گھوڑوں کا انتخاب کیا جا سکے۔

یہ خبر سنتے ہی وہ مچل گیا۔ باپ سے چھپ چھپا کر گھڑ دوڑ کے میدان کے اس حصے میں آیا' جدھر وہ اپنی کانی آنکھ سے اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہاں نئے گھوڑوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ چابک سوار انہیں قدم بہ قدم چلا کر دیکھ رہے تھے۔ فیلقوس اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا ایک آنکھ سے گھورتا ہوا ان کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اس نے سر گھمایا تو سالم آنکھ سے سکندر نظر آ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا مشقیں ادھوری چھوڑ کر وہاں آئے مگر اس وقت اس نے طرح دے دی۔ بیٹے سے کچھ نہ کہا۔ بیٹا بڑے انہماک سے ان گھوڑوں کی چال ڈھال دیکھ رہا تھا۔ اس کا ایسا اشتیاق دیکھ کر فیلقوس زیرِ لب مسکرانے لگا۔ پھر اپنے چابک سواروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سکندر دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ایک سیاہ گھوڑا بہت ہی نٹ کھٹ ہے۔ وہ اس طرح اچھل کود رہا تھا' جیسے باگیں چھڑا کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔ اس سرکش گھوڑے

نے سب ہی کو پریشان کیا ہوا تھا۔ چابک سوار اس پر سوار ہونا چاہتا تو وہ دولتیاں جھاڑتا ہوا اسے دور رہنے پر مجبور کر دیتا۔ سکندر دور بیٹھا بڑی محویت سے اس گھوڑے کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ جن افراد نے اس کی لگام تھامی ہوئی تھی' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''یہ بہت اڑیل ہے۔ اسے قابو میں کرنے اور سوار ہونے کے لئے اس کے منہ پر کپڑا ڈالنا ہوگا۔''

چنانچہ اس شخص کے مشورے کے مطابق یہی کیا گیا۔ پھر فوراً ہی ایک شخص کو اس کی پیٹھ پر سوار کر دیا گیا۔ گھوڑا ایسی صورتحال سے مزید بدک گیا۔ ہنہناتا ہوا اگلی دو ٹانگیں اٹھا کر فضا میں بلند ہوا تو وہ سوار دھم سے زمین پر گر پڑا۔ اسے رام کرنے والے بری طرح جھنجلا گئے تھے۔ چابک سوار نے بیزاری سے کہا۔ ''اس گھوڑے کی کوئی نہ کوئی کل بگڑی ہوئی ہے۔ اسے قابو میں کرنے کے لئے بہت وقت چاہئے۔''

سکندر اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ''اس گھوڑے کی سرکشی بالکل طبعی ہے۔ یہ لوگ سمجھ کیوں نہیں رہے ہیں؟ وہ لوگوں کے ہجوم سے اور یہاں کے ہنگامے سے پریشان ہے۔ اسی لئے بار بار بدک رہا ہے۔''

لہٰذا اس چابک سوار کے مشورے کے مطابق جب اس سرکش گھوڑے کو مسترد کیا گیا تو سکندر بے چین ہو کر ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''ایسے خوبصورت گھوڑے کو کھو دینا بے وقوفی ہوگی۔''

چابک سوار نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''یہ جتنا خوبصورت ہے' اتنا ہی سرکش ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔''

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ چابک سوار ہی کیا' جو ایک اڑیل گھوڑے کو قابو نہ کر سکے؟''

وہ اس کے طنز پر تلملا کر رہ گیا۔ ''میں نے اس سے کہیں زیادہ سرکش گھوڑوں کو سیدھا کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن ابھی اسے سدھانے کا وقت نہیں ہے۔''

''جانور کو سمجھنے اور اسے اپنی بات سمجھانے کے لئے وقت کی نہیں... عقل کی



ضرورت ہوتی ہے۔''

فیلقوس بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''کیا مسئلہ ہے؟''

سکندر نے اس گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک بہترین گھوڑا ہے۔ لیکن افسوس تیرا چابک سوار اسے مسترد کر رہا ہے۔''

چابک سوار نے کہا۔ ''تُو دیکھ ہی رہا ہے شاہ فیلقوس...! یہ بہت سرکش ہے۔''

سکندر نے کہا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتا کہ تُو اسے سنبھال نہیں پا رہا ہے؟''

فیلقوس نے کہا۔ ''کیا تُو یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرے چابک سوار گھوڑوں کو قابو میں لانے کے اہل نہیں ہیں؟''

وہ بولا۔ ''یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میں اس گھوڑے کو قابو میں کر کے اس میدان کا چکر لگا سکتا ہوں۔''

فیلقوس نے سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ چابک سوار کو ہتک سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک کم سن لڑکا اس کے تجربے پر انگلی اٹھا رہا تھا۔ فیلقوس نے پوچھا۔ ''اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اس حماقت کا جرمانہ کیا دو گے؟''

سکندر کی نگاہیں اس سیاہ چمکیلے گھوڑے پر جمی ہوئی تھیں اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''اس کی قیمت کیا ہے؟''

چابک سوار نے کہا۔ ''تیرہ ٹیلنٹ...''

''اگر میں اسے قابو نہ کر سکا تو اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔''

بیٹے کا یہ انداز فیلقوس کو متاثر کر رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا لیکن اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے بولا۔ ''اور اگر تُو نے اسے رام کر لیا تو میں انعام کے طور پر اس گھوڑے کو تیرے حوالے کر دوں گا۔''

سکندر کے لئے اس سے بڑا انعام تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہاں مقابلے کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سب ہی سکندر کی طرف متوجہ تھے۔ معاملہ طے ہو جانے کے بعد وہ

گھوڑے کے پاس چلا آیا اور فیلقوس اپنی نشست پر آکر بیٹے کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

اس نے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور اس کے سر سے کپڑا ہٹا کر اسے دھیرے دھیرے تھپک رہا تھا۔ پھر آس پاس کھڑے ہوئے رکھوالوں سے بولا۔ "تم سب پیچھے ہٹ جاؤ۔"

اس کے حکم کے مطابق سب ہی وہاں سے دور چلے گئے۔ وہ بدستور اسے تھپک رہا تھا۔ اس کے ایسے انداز سے گھوڑے کے جسم کے تناؤ میں کمی آتی جا رہی تھی۔ سکندر نے آہستہ آہستہ اس کا منہ سورج کی طرف پھیر دیا۔ پھر جب اس نے سر جھکا کر گھاس کھانی شروع کی تو سکندر فوراً ہی اچک کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ ایسے وقت اس نے لگام ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی۔ گھوڑے نے ایک ذرا بدک کر آگے کو چھلانگ لگائی۔ سکندر کی پوری کوشش تھی کہ اس کا منہ سورج کی طرف رہے۔

وہ ایڑ لگائے بغیر دوڑتا جا رہا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد سکندر نے لگام کھینچ کر اسے میدان کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔ وہ گھوڑا تھوڑی دیر تک تو تنا رہا پھر رفتہ رفتہ لگام کے اشارے پر دوڑنے لگا۔ فیلقوس کے قریب بیٹھا ہوا چابک سوار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بے یقینی سے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سکندر نے ایک چکر مکمل کر کے گھوڑے کی باگیں کھینچیں تو وہ قدم بہ قدم چلنے لگا۔

فیلقوس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چابک سوار نے بے اختیار تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "شاباش.... کیا خوب سواری کی ہے؟"

فیلقوس خاموش تھا۔ جب وہ گھوڑے سے اتر کر اس کے پاس آکر بیٹھا تو اس نے کہا۔ "حیرت ہے، جو کام تجربہ کار چابک سوار نہ کر سکا' وہ تُو نے کیسے کر لیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں گھوڑے کی ایک ایک حرکت کو بڑے غور سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ لوگوں کے ہجوم سے پریشان تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ جب اسے اپنا سایہ دکھائی دیتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس کا منہ سورج کی



طرف کر دیا تھا۔"

وہ خوش ہو کر بیٹے کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "بہترین گھڑ سوار وہی ہوتا ہے' جو گھوڑے کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ اس تھسلی گھوڑے کا نام بیوسی فالس ہے۔ تُو نے زندگی میں پہلی کامیابی حاصل کی ہے، آج سے یہ تیری ملکیت ہے۔"

وہ اس خوبصورت تحفے کو پا کر بہت خوش تھا۔ اپنی اس کامیابی کے بارے میں ماں کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ فوراً ہی محل میں آ گیا۔ لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ چاروں طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر ملازموں سے دریافت کیا تو ایک ملازم نے کہا۔ "وہ... بطلیموس کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

دوسرے ملازم نے کہا۔ "سب ہی جانتے ہیں' اولمپیاس کے پاس ہر طرح کے زہر کا توڑ موجود ہے۔ آرسی نوئی بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے اس کی منت سماجت کر رہی ہے۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ اس کا مخصوص صندوق کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اس میں کارآمد دوائیں ہیں، ان کے بغیر زہر کا توڑ ممکن نہیں ہے۔"

سکندر اپنی ماں کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا۔ وہ سوتیلا سہی مگر انسانیت کا تقاضا اسے مجبور کر رہا تھا کہ تمام عداوتوں کو بھول کر کسی بھی طرح اس کی جان بچانا ضروری ہے۔ اس نے ملازم سے پوچھا۔ "بطلیموس کہاں ہے؟"

"وہ اپنی خوابگاہ میں ہے۔"

اس نے ایک ملازم سے کہا۔ "تُو ابھی جا کر اولمپیاس کو یہ خبر سنا کہ سکندر کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اسے اس کی خوابگاہ میں لایا جا رہا ہے۔ وہ فوراً زہر کے توڑ کا بندوبست کرے۔"

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ "وقت کم ہے۔ جیسا کہا جا رہا ہے' ویسا کر۔"

وہ ملازم حکم کی تکمیل کے لئے وہاں سے چلا گیا۔ وہ دوسرے ملازموں کے ساتھ

تقریباً دوڑتا ہوا بطلیموس کی خوابگاہ میں آیا۔ آرسی نوئی روتی ہوئی اس کی طرف لپکتے ہوئے بولی۔ "اپنی ماں کو سمجھا.... میرے بیٹے سے دشمنی نہ کرے۔ تُو جانتا ہے' وہ اسے بچا سکتی ہے۔"

"جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت ضدی ہے۔ اس کی ناں کو ہاں میں بدلنا مشکل ہوتا ہے۔"

بطلیموس بستر پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کی دائیں پنڈلی پر سانپ کے ڈسنے کا واضح نشان دکھائی دے رہا تھا۔ سکندر نے ساتھ آنے والے ملازموں کو حکم دیا۔ "اسے چادر سے ڈھانپ کر فوراً اولمپیاس کی خوابگاہ میں لے جاؤ اور اس پر یہی ظاہر کرتے رہو کہ یہ بطلیموس نہیں... سکندر ہے۔"

ملازم نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "وہ چادر ہٹا کر دیکھے گی تو جھوٹ بولنے کی سزا پر ہماری کھال کھنچوا دے گی۔"

وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "فکر نہ کرو۔ ایسے وقت میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ دیر نہ کرو۔ اسے فوراً وہاں لے جاؤ۔"

دوسری طرف اولمپیاس ایسی خبر سن کر بوکھلا گئی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ بے ہوش سکندر کو وہاں لایا جا رہا ہے۔ وہ فوراً ہی اپنا مخصوص صندوق نکال کر دوا تیار کرنے لگی۔ اس کے پاس ایسا موثر نسخہ موجود تھا' جسے زخم پر لگایا جاتا تھا تو فوراً ہی زہر کا اثر زائل ہونے لگتا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ جب چادر میں چھپے ہوئے بطلیموس کو لا کر بستر پر لٹایا گیا تو وہ فوراً ہی اس کی پنڈلی پر دوا لگانے لگی۔ ایسی حواس باختہ ہوئی تھی کہ چادر ہٹا کر دیکھنے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

جو ملازم بطلیموس کو وہاں لائے تھے' وہ دم سادھے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے وقت سکندر خوابگاہ میں داخل ہوا۔ اولمپیاس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ یہ دیکھ نہ پائی کہ بیٹا صحیح سلامت اس کے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بچ تو جائے گا نا....؟"



اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر جلدی سے کہا۔ "ہاں۔ ہاں۔ یہ برسوں کا آزمودہ نسخہ....."

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ایک جھٹکے سے پلٹ کر دیکھا۔ سکندر بدستور مسکرا رہا تھا۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے بولی۔ "سکندر....؟ تُو یہاں ہے تو....؟"

وہ ایکدم سے ٹھٹک گئی۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس کے تیور بگڑ گئے۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر بطلیموس کے جسم سے چادر کھینچی تو وہاں سوکن کے بیٹے کا چہرہ دیکھ کر سیخ پا ہو گئی۔ اس نے گھور کر ملازموں کو دیکھا۔ پھر گرج کر پوچھا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

ملازم ایکدم سے سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ سکندر نے کہا۔ "کیونکہ اس کا علاج صرف تیرے پاس تھا۔"

وہ شدید نفرت سے بولی۔ "مگر میں اس کا علاج نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تُو نے اس سوتیلے کے لئے اتنا بڑا جھوٹ کیوں کہا....؟"

"اگر میں یہ جھوٹ نہ بولتا تو تُو کبھی اس کے زہر کا توڑ نہ کرتی۔ جان بوجھ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیتی۔"

"دشمن سے ہمدردی نہیں کرنی چاہئے۔"

"میں نے بطلیموس سے کوئی ہمدردی نہیں کی ہے۔ صرف تیرا مان مرتبہ بچانے کے لئے یہ جھوٹ بولا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو سارا الزام تیرے سر آتا۔ کیونکہ زہریلے سانپ تُو ہی پالتی ہے۔ اس شبہ کے تحت فیلقوس تجھے محل سے ہی نکال دیتا۔"

اس نے ایک ذرا قائل ہو کر بیٹے کو دیکھا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ ایک سوتیلے رشتے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے سلسلے میں بہت بڑی نادانی کرنے والی تھی۔ اس نے بے ہوش بطلیموس کو دیکھتے ہوئے ملازموں کو حکم دیا۔ "اسے ابھی اور اسی وقت اٹھا کر یہاں سے لے جاؤ۔"

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”مگر اس کا علاج....؟“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ کڑوے رشتے زہر سے مرنے والے نہیں ہیں۔ اس کی ماں سے کہہ دو' یہ خطرے سے باہر ہے۔“

وہ ملازم بطلیموس کو اٹھا کر وہاں سے لے گئے۔ تنہائی پاتے ہی سکندر اسے گھڑ دوڑ کے میدان کا احوال بتاتے ہوئے بولا۔ ”لیونی دس کہتا ہے' میرے اندر بہت سی خداداد صلاحیتیں موجود ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک طرف میں نے اس بے زبان جانور کو اپنا تابعدار بنالیا ہے اور دوسری طرف تجھ جیسی ضدی ماں کو ایک بہت بڑی غلطی کرنے سے روک دیا ہے۔ یہ میری زندگی کی بہت بڑی کامیابیاں ہیں۔ ویسے ان کا سہرا بیوسی فالس کے سر جاتا ہے۔ وہ میرے لئے خوش قدم ثابت ہو رہا ہے۔“

سکندر بیوسی فالس نامی اس خوبصورت گھوڑے کو حاصل کر کے بہت خوش تھا۔ دن کا زیادہ تر حصہ اسی کے ساتھ گزارنے لگا تھا۔ ایسے وقت اسے خبر ملی کہ اس کے اور بطلیموس کے مشترکہ اتالیق لیونی دس کو پیلا سے باہر بھیج دیا گیا ہے اور شاہ فیلقوس کے حکم کے مطابق شہر سے دور میزا نامی علاقے کے ایک پرانے شکستہ مندر کی مرمت کی جارہی ہے۔ باپ کے ایسے احکامات اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ اس نے ماں سے دریافت کیا تو وہ بولی۔ ”شاہ فیلقوس کا کہنا ہے کہ تجھے اور بطلیموس کو لیونی دس کی نہیں' بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل اتالیق کی ضرورت ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”اور وہ قابل اتالیق کون ہوگا؟“

”اسٹے جیرا (Stagyra) کا باشندہ ہے۔ ارسطو نام ہے۔ بہت ہی قابل طبیب اور فلسفی ہے۔ میں نے سنا ہے' اس یونانی اتالیق کا باپ تیرے دادا کا طبیب خاص ہوا کرتا تھا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا فیلقوس مجھے اور بطلیموس کو طب پڑھانا چاہتا ہے؟“

اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔ آجکل تُو ہرقل کو بھول کر ہومر کے افسانوں



کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کبھی ایکی لیز کے کارنامے پڑھتا رہتا ہے اور کبھی اس مرحوم یونانی شاعر... کیا نام تھا اس کا...؟ ہاں۔ یاد آیا.... یوری پائیڈیز کو پڑھتا ہے۔ فیلقوس کا کہنا ہے' تجھے بیمار روحوں سے پیار ہے تو طبیب بن جا... کیونکہ طبیبوں کو آج تک کسی نے قتل نہیں کیا۔“

وہ سر جھٹک کر مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ”لیونی دس کو رخصت کرنے کی وجہ تو سمجھ میں آگئی۔ لیکن میزا کے اس پرانے مندر کی مرمت کیوں کی جارہی ہے؟“

”اسے درسگاہ بنایا جائے گا۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”درسگاہ....؟“

”تُو بطلیموس کے ساتھ وہیں تعلیم حاصل کیا کرے گا۔“

پھر وہ ایک ذرا ناگواری سے بولی۔ ”تُو اپنے بیوسی فالس کو خوش قدم کہتا ہے۔ لیکن میں اسے سبز قدم کہوں گی۔ اس کے آنے سے میرا بیٹا مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ شاید اسی لئے مجھے اس یونانی اتالیق سے بھی نفرت سی محسوس ہو رہی ہے۔“

اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر ماں کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”وہ یہاں محل کی مطالعہ گاہ میں بھی تو تجھے تعلیم دے سکتا تھا۔ لیکن فیلقوس اس کی رائے کے مطابق اس کھنڈر کو درسگاہ بنا رہا ہے۔ میں جاننا چاہوں گی' آخر اس یونانی فلسفی کی اس حکمت عملی میں کون سا فلسفہ چھپا ہوا ہے؟“

اس کی گہری سوچتی ہوئی نگاہیں خلاء میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ جیسے ارسطو کے متعلق بہت کچھ جاننے کے لئے بے چین ہوں۔ پھر اس نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فیلقوس نے کہا ہے' تجھے جب بھی چھٹی ملا کرے گی تُو میزا سے اس سیاہ گھوڑے پر یہاں آیا کرے گا۔ اس طرح گھڑ سواری کا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا۔“

اس نے خوش ہوکر اولمپیاس کو دیکھا۔ اگرچہ محل سے جدائی اسے افسردہ کر رہی تھی۔ لیکن یہ سن کر خوشی ہوئی تھی کہ اس کے چہیتے گھوڑے بیوسی فالس کو بھی اس کے ساتھ روانہ کیا جائے گا۔

کچھ عرصہ بعد مندر کی مرمت مکمل ہوگئی اور ارسطو شاہ مقدونیہ کے پیغام کے مطابق میزا پہنچ گیا۔ ارسطو ایتھنز کے مشہور و معروف اتالیق افلاطون کے شاگردوں میں سے تھا۔ لیکن کئی معاملات میں یہ استاد اور شاگرد ایک دوسرے سے اختلافات رکھتے تھے۔ چنانچہ جب فیلقوس کی طرف سے یہ پیغام موصول ہوا کہ وہ اسے اپنے بیٹوں کا استاد مقرر کرنا چاہتا ہے تو ارسطو فوراً ہی اس کی پیشکش قبول کر کے مقدونیہ چلا آیا۔

یونانیوں کی علمی صلاحیتوں کو سب ہی مانتے تھے۔ فیلقوس نے بہت سوچ سمجھ کر ارسطو کو پیلا آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ بڑی خوشدلی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سنا ہے' ڈیماس تھینز بھی افلاطون کے شاگردوں میں سے ہے؟''

وہ تائید میں سر ہلا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں اور ڈیماس تھینز ... ہم دو ہی ایسے شاگرد ہیں' جن سے افلاطون اکثر نالاں رہتا ہے۔''

''اگرچہ وہ میرا زبردست مخالف ہے۔ لیکن میں ڈیماس تھینز کی علمی قابلیت کو دل سے تسلیم کرتا ہوں۔''

''بے شک۔ کسی بھی دشمن کی خامیوں سے زیادہ اس کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہئے۔''

کھانے کے بعد بطلیموس اور سکندر سے اس کی ملاقات کرائی گئی۔ سکندر نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ دن رات مطالعہ میں غرق رہتا ہوں۔ یہاں سب مجھے کتابی کیڑا کہتے ہیں۔''

وہ گہری سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کتابیں پڑھنا اور کتابی کیڑا بننا دو مختلف باتیں ہیں۔ تُو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟''

''کم از کم کیڑا نہیں سمجھتا... کیونکہ ایک کیڑا ان کتابوں سے کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔ جبکہ میں ان کے ایک ایک صفحے سے بہت کچھ سیکھتا اور سمجھتا رہتا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ تُو نے کیا سیکھا اور کیا سمجھا ہے....؟



لیکن سیکھنے کے ہر عمل میں اعتدال ضروری ہوتا ہے۔ کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ بطلیموس کو اگر شمشیر زنی کا شوق ہے تو یہ دن رات ہاتھ میں تلوار اٹھائے فنِ سپاہ گری کا مظاہرہ کرتا رہے؟''

اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ سابقہ استاد لیونی دس سے اسی بات پر جھگڑا رہتا تھا کہ سکندر رات گئے تک مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہے۔ سونے کا وقت مقرر نہیں ہے' اسی لئے صبح کے وقت اس کی طبیعت بوجھل رہتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ارسطو کے سمجھانے کا طریقہ ایسا موثر تھا کہ جو بات لیونی دس ایک عرصے سے سمجھا نہیں پایا تھا۔ وہ ارسطو نے پہلی ہی ملاقات میں اسے سمجھا دی تھی۔

میزا کے پرانے مندر کو ارسطو کی درسگاہ خاص بنا دیا گیا تھا۔ اولمپیاس اس یونانی طبیب کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی تھی۔ لیکن اب تک اُتنا ہی معلوم کر پائی تھی' جتنا کہ فیلقوس نے اسے بتایا تھا۔ لہٰذا جب تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے اس مقصد کے لئے اپنے چند جاسوس مقرر کئے۔ وہ میزا کے آس پاس رہتے تھے اور اولمپیاس کو درسگاہ کے اندرونی معاملات کے بارے میں باخبر کرتے رہتے تھے۔

ایک جاسوس نے اطلاع دی تھی کہ وہ معلم شہزادوں کو صرف طب نہیں پڑھاتا ہے۔ اس طبیب کو علم سیاسیات پر بھی عبور حاصل ہے۔ وہ قابل اعتماد جرنیل اینٹی پیٹر کا دوست ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فیلقوس بھی مشوروں کے لئے اسی فلسفی کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''آخر ایسی بھی کیا قابلیت ہے اس فلسفی میں کہ فیلقوس اس کے مشوروں کا محتاج رہنے لگا ہے؟''

ایسی خبریں اسے ارسطو سے ملنے کے لئے بے چین کر رہی تھیں۔ اگرچہ اولمپیاس کو کتابوں سے ایک ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن وہ شاطر عورت یہ خوب جانتی تھی کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ وہ دو چار کتابیں پڑھ کر' اپنی علمی قابلیت کی دھونس جما کر اس لوہے کو

توڑ نہیں سکتی تھی، مگر موڑ تو سکتی تھی۔

لہٰذا میزا جانے سے پہلے اس نے یوری پائیڈیز کے المیہ ڈراموں، خصوصاً میڈیا کو بڑے غور وتوجہ سے پڑھا۔ میڈیا یونانی افسانوں کی ایک مشہور شہزادی تھی۔ وہ جادو جانتی تھی۔ اس نے تنہا مردوں کی قوت کا مقابلہ کیا۔ اولمپیاس اس کے بارے میں پڑھ کر اپنے اندر یوں توانائی محسوس کر رہی تھی، جیسے میڈیا کی ساحرانہ قوتیں اس کے اندر سما گئی ہوں۔

اس نے اس ڈرامے کے بہت سے اہم اور متاثر کرنے والے فقرے ازبر کر لئے تھے۔ یہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اس نامی گرامی فلسفی سے گفتگو کے دوران ان فقروں کا حوالہ دیتی رہے گی اور اسے متاثر کرتی رہے گی۔ جس طرح سپاہی زرہ بکتر پہن کر ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان جنگ میں جاتا ہے، اسی طرح وہ ارسطو کی طرف چل پڑی۔

سکندر اور بطلیموس کو مندر کا ایک وسیع وعریض آراستہ کمرہ رہائش کے لئے دیا گیا تھا۔ بطلیموس اس مندر کی ایک زومائلہ نامی داسی پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ وہ بڑی ہی حسین اور طرح دار تھی۔ پوجا کے وقت دیوتا کے سامنے رقص کرتی تھی۔ اس رقاصہ کے بدن کا ایک ایک لوچ قابلِ دید ہوتا تھا۔

زومائلہ بھی پہلی ہی ملاقات میں اسے دل دے بیٹھی تھی۔ سکندر دیکھ رہا تھا، بطلیموس کا ذہن تعلیم وتربیت کے دوران بھٹکتا رہتا تھا۔ دریچے کے باہر کبھی کبھی وہ گزرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ سکندر نے پوچھا۔ ”تُو ایسا تو نہیں تھا....؟ پھر ایک رقاصہ کے لئے کیوں پاگل ہو رہا ہے؟“

اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”یہ دل کا معاملہ ہے۔ جب تیرا دل کسی پر آئے گا، تب تجھے معلوم ہوگا کہ کوئی دل میں اتر آنے والی کس طرح دیوانہ بنا دیتی ہے؟“

دل کا معاملہ ارسطو سے چھپ نہ سکا۔ دونوں جوانوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جب دل گمراہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے دماغ کو کمزور بناتا ہے۔ اسے سوچنے سمجھنے کے قابل



نہیں رہنے دیتا۔ عورت سے سحر زدہ ہونے والے اپنی منزل سے بھٹک جاتے ہیں۔“

بطلیموس نے کہا۔ ”اے استادِ معظم! کیا میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ کسی حسینہ نے تجھے بھی جوانی میں سحر زدہ کیا ہوگا؟“

سکندر نے اسے کہنی ماری، وہ اسے ایسی بحث سے روکنا چاہتا تھا۔ ارسطو نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ ”استاد سے سوال نہیں کرو گے تو علم کیسے حاصل کرو گے؟ بے شک۔ میری زندگی میں بھی عورتیں آئی تھیں۔ لیکن میں نے حصولِ علم کے آگے انہیں اہمیت نہیں دی۔ عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ، جو کھلی دغاباز ہوتی ہیں۔ زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔ اور دوسری وہ، جو بڑے پیار سے، بڑی اداؤں سے شریکِ حیات بنتی ہیں۔ جبکہ تمہاری عمر میں صرف علم کو شریکِ حیات رہنا چاہئے۔“

وہ ایک ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کسی بھی عورت کو آزما کر دیکھ لو۔ وہ اداؤں سے بھرپور محبت کی دیوی ہوگی لیکن تمہارے اہم اور بنیادی مقاصد کو پیچھے دھکیل دے گی۔“

اس عاشق نے سر جھکا دیا، مزید بحث نہیں کی۔ دوسری صبح زومائلہ نے شکایت کی۔ ”کل رات کہاں تھا؟ میرا رقص دیکھنے سب ہی پجاری اور دیوتا کے عقیدت مند آئے۔ تُو کیوں نہیں آیا؟“

سکندر نے وہاں آ کر کہا۔ ”استادِ محترم کو ساری خبر مل گئی ہے۔ بطلیموس کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ تیرے سحر میں نہ آئے۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”کیا میں کوئی ساحرہ ہوں؟ جادو ٹونا کرتی ہوں؟“

بطلیموس نے کہا۔ ”وہ کہتا ہے، جوانی میں سب ہی عورتیں جادوگرنی بن جاتی ہیں۔ بڑے سے بڑے شہزور کو میاں مٹھو بنا لیتی ہیں۔“

وہ پھر ناگواری سے بولی۔ ”پھر تو وہ بھی جوانی میں میاں مٹھو بن چکا ہوگا؟“

سکندر نے کہا۔ ”نہیں۔ استادِ محترم کا دعویٰ ہے، وہ کبھی کسی عورت کے فریب میں نہیں آیا۔ بے شک۔ ہمارا استاد فولادی ارادوں کا مالک ہے۔“

"اُونہہ..... میں چاہوں تو چٹکی بجا کر اس فولاد کو پگھلا سکتی ہوں۔ یہ استاد اپنی جوانی کا سبق بھول جاتے ہیں اور شاگردوں کو پارسائی کا سبق پڑھاتے ہیں۔"

بطلیموس نے کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ وہ دیکھو استاد محترم فوارے کے پاس آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہمیں جانا چاہئے۔"

وہ دونوں جانا چاہتے تھے۔ زومائلہ نے اپنے عاشق کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "رک جاؤ۔ تمہارے استاد نے میری توہین کی ہے۔ میں ابھی ثابت کروں گی کہ یہ شاگردوں کے سامنے خوامخواہ پارسا بنتا ہے۔ یہاں ٹھہرو اور اپنے استاد کا تماشہ دیکھو۔"

ارسطو اپنی جگہ سے اٹھ کر وسیع وعریض باغ کے فوارے کے پاس ٹہل رہا تھا۔ کسی پیچیدہ نکتے پر غور کر رہا تھا۔ زومائلہ رقص کے انداز میں بدن کو لچکاتی، کمر کو مٹکاتی فوارے کی طرف آ رہی تھی۔ ارسطو ایک جگہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے لباس کو لہراتی ہوئی اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔

ارسطو نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "خوشبو میں بسی ہے۔"

وہ رک گئی۔ پلٹ کر بولی۔ "اے بزرگ! کیا تو مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے؟"

"ہاں۔ تو نے کچھ زیادہ ہی خوشبو انڈیل لی ہے۔"

"کیا تجھے خوشبو پسند نہیں ہے؟"

"پسند ہے۔ تب ہی میں نے سانسوں میں بھر لی ہے۔"

وہ ایک ادائے ناز سے بل کھاتے ہوئے بولی۔ "کیا میں حسین ہوں؟"

"تو حسین بھی ہے اور دلنشین بھی.... میں نے تجھے دیوتا کے سامنے رقص کرتے دیکھا ہے۔ تو دیکھنے والوں کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔"

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "جوانوں کو دیوانہ بنایا تو کیا بنایا؟ حسرت ہے کہ کوئی بوڑھا میرا دلدار بن جائے۔"

"پھر سمجھ لے۔ تیری حسرت پوری ہو چکی ہے۔ کیا اس بوڑھے دل کی قدر کرے گی؟"



"میں دل سے قدر کروں گی مگر پہلے آزماؤں گی کہ تو مجھے حاصل کرنے کے لئے کیا کر سکتا ہے؟"

"جس طرح چاہے آزما لے۔"

"مجھے گھڑ سواری بہت پسند ہے۔ کیا تو میرا گھوڑا بن سکتا ہے؟"

"بن تو سکتا ہوں مگر یہ بوڑھی ہڈیاں اپنی پیٹھ پر تیرا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تیرے منہ میں ایک رسی سے لگام ڈالوں گی۔ پھر اس لگام کو تھام کر تجھے ہانکتی جاؤں گی۔ تو آگے آگے دوڑتا جائے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تو بچوں والا کھیل کھیلنا چاہتی ہے، کوئی بات نہیں، چل آ اور میرے منہ میں لگام دے۔"

اس نے فوارے کے چبوترے پر رکھی ہوئی رسی اٹھا کر اس کے منہ میں دانتوں کے درمیان دی۔ پھر اس کے پیچھے آ کر رسی کے دونوں سروں کو تھام کر اسے ہانکتے ہوئے بولی۔ "چل میرے گھوڑے ٹمبک ٹو... پیچھے میں ہوں آگے تو...."

سکندر اور بطلیموس حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے استاد کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے سبق پڑھایا تھا، عورت سے دور رہنا چاہئے۔ مگر وہ تو اس حسین رقاصہ کے لئے گھوڑا بن گیا تھا اور فوارے کے چاروں طرف گھوڑے کی طرح ڈلکی چال چلتا ہوا زومائلہ کے آگے آگے جا رہا تھا۔ یونان سے مقدونیہ تک اپنی ذہانت کا سکہ جمانے والے فلسفی نے اپنی لگام ایک عورت کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔

وہ دونوں اپنے استاد کی توہین برداشت نہ کر سکے۔ جس سے تعلیم وتربیت حاصل کر رہے تھے، اسے زومائلہ گھوڑا بنا چکی تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے وہاں آئے تو ارسطو رک گیا۔ زومائلہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "دیکھ بطلیموس...! یہ تجھے عورتوں سے دور رہنے کا سبق پڑھا رہا تھا۔ دیکھو کہ ایک عورت نے اس کے منہ میں کیسے لگام دی ہے؟"

ارسطو فوارے کے چبوترے پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ سکندر نے کہا۔ "استاد محترم!

تیری اس حرکت سے ہمارا سر جھک گیا ہے۔"

وہ بولا۔"اچھا سبق سر جھکا کر ہی پڑھا جاتا ہے۔ میں پڑھانا جانتا ہوں۔ تم پڑھنا سیکھو۔ میں جانتا تھا' تم دونوں چھپ کر تماشہ دیکھ رہے ہو۔ تمہیں پڑھانے کا اس سے اچھا موقع اور کہاں مل سکتا تھا؟"

وہ چبوترے سے اٹھتے ہوئے بولا۔"جو منظر تم نے دیکھا' اسے صرف دیکھنا ہی نہیں' سمجھنا بھی ہے۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ جب ایک عورت مجھ جیسے تجربہ کار بوڑھے کو گھوڑا بنا سکتی ہے تو اے کچے ذہن کے نوجوانو...! سوچو اور سمجھو کہ یہ تمہیں کس طرح گدھا بنا سکتی ہے؟"

وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔"آج کا پہلا سبق یہی ہے.... درسگاہ میں آجاؤ۔"

زومائلہ کے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ وہ مردوں کو اُلّو بنانے والی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک خرانٹ بوڑھا اسے اُلّو بنا رہا ہے۔ وہ شرمندہ سی ہو کر بطلیموس کو دیکھ رہی تھی اور وہ دونوں شاگرد بڑے فخر سے اپنے استاد کو درسگاہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

===✿===
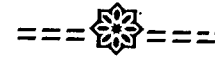


میزا (Meiza) کی خاموش فضا میں ساحلی ہواؤں نے ہلچل سی مچا رکھی تھی۔ ان کی زد میں آنے والی ہر شے جگہ سے بے جگہ ہو رہی تھی۔ شاخوں سے گرے ہوئے پتے ہوا کی ٹھوکروں سے کبھی ادھر اور کبھی ادھر ہو رہے تھے' جیسے بھٹکے ہوئے مسافر راستہ تلاش کر رہے ہوں۔ میزا کی آبادی بہت کم تھی۔ اس لئے گلیاں عموماً ویران رہتی تھیں۔ موسم کے بدلے ہوئے تیور نے اس ویرانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

ہواؤں کی سنسناہٹ اور آوارہ پتوں کی سرسراہٹ میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اولمپیاس کی شاہانہ سواری آڑی ترچھی گلیوں سے گزرتی ہوئی مندر کی طرف آ رہی تھی۔ وہ پریوں کا مندر کہلاتا تھا۔ اسے ارسطو کی درسگاہ خاص بنا دیا گیا تھا۔ وہ کھڑکی کے پار اس عمارت کو دیکھ رہی تھی، جو اپنی تمام تر بوسیدگی کے باوجود بڑی باوقار دکھائی دے رہی تھی۔

اولمپیاس نے گہری نظروں سے ادھر دیکھا، پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز ایسا تھا' جیسے کوئی فاتح اعظم کسی نئی سلطنت پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑنے جا رہا ہو۔ وہ کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ اپنی شخصیت اور ذہانت کا سحر پھونک کر دوسروں کو متاثر کرنے کی فکر میں لگی رہتی تھی۔ ارسطو جیسے نامور فلسفی سے ملاقات کے لئے بھی اس نے خوب تیاریاں کی تھیں۔ وہ اس کی علمی قابلیت سے واقف تھی۔ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ علم کے میدان کا سپاہی ہے۔ کتاب کو ہتھیار کے طور پر

استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اسی کتاب کو اپنی ڈھال بنا کر اس کے مقابلے پر اترنے والی تھی۔

اس نے میزا آنے سے پہلے یوری پائیڈیز کے جن المیہ ڈراموں کو پڑھا تھا' ان میں شہزادی میڈیا کا کردار اسے بہت متاثر کرتا رہا تھا۔ وہ ساحرہ صفت شہزادی اولمپیاس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی اور وہ اس کی شخصیت کو مہرہ بنا کر ارسطو کی بساط پر چالیں چلنے والی تھی۔

سواری مندر کے احاطے میں پہنچ کر رک گئی۔ اس نے رتھ سے اترتے ہوئے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وسیع و عریض باغیچے کے پار مندر کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک ایک قدم چلتی ہوئی آس پاس کا جائزہ لیتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ایسے وقت اس کی دو کنیزیں بھی اس کے ہمراہ تھیں۔ وہاں ارسطو کے معاون' مندر کے ملازم اور درجنوں داسیاں سب ہی ہاتھ باندھے سر جھکائے اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ قیمتی لباس میں ملبوس' اعلیٰ خوشبوؤں میں بسی' بڑے ہی شاہانہ انداز میں ان کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کا ریشمی لباس ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے ایسے لہرا رہا تھا' جیسے بڑی مستی میں جھوم رہا ہو۔ اس کی ایک ایک لہر اولمپیاس کے غضبناک بدن کی تشریح کرتی جا رہی تھی۔ وہ کوئی الجھی ہوئی غزل نہیں تھی۔ لیکن کسی بھی غزل کی اصل تک پہنچنے کے لئے تشریح کا سہارا لیا ہی جاتا ہے۔ وہاں دیکھنے والی ہر آنکھ اس سہارے سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اولمپیاس کو امید تھی کہ وہ اتالیق اسے خوش آمدید کہنے کے لئے مندر کے دروازے پر اس کا منتظر ہوگا۔ لیکن سرسبز باغیچے میں دور دور تک وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سامنے عمارت کے استقبالیہ پر بھی صرف خدمت گاروں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ اس نے ارسطو کے ایک معاون سے پوچھا۔ ''ہمارا میزبان کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے؟''



وہ سر جھکا کر بڑے ادب سے بولا۔ ''استادِ محترم پائیں باغ میں شہزادوں کے ساتھ مصروف ہیں۔''

معاون کی بات سن کر اس کے تیور بگڑ گئے۔ اسے ایسے روّیے کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ ارسطو استقبال کے لئے ہاتھ باندھے سر جھکائے وہاں اس کا منتظر ہوگا، مگر وہ اس کی آمد پر اپنی مصروفیات کو ترجیح دے کر گویا اس کی اہمیت کم کر رہا تھا۔ اس کی یہ حرکت سراسر اولمپیاس کے مزاج کے خلاف تھی۔ اس نے ایک ذرا ناگواری سے پوچھا۔ ''کیا اسے ہماری آمد کا علم نہیں ہے؟''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ''اس نے تجھے مندر کے بڑے کمرے میں بٹھانے کا حکم دیا ہے۔''

اس نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے باغیچے کے اس حصے کو گھورا' جس کا راستہ پائیں باغ کی طرف جاتا تھا۔ پھر غصے سے سوچا۔ ''یہ فلسفی تو بڑا کائیاں نکلا۔ مجھے کمرے میں بٹھا کر' اپنا منتظر بنا کر اپنی اہمیت جتانا چاہتا ہے۔ میں تیری حکمت عملی کو سمجھ گئی ہوں ارسطو...! تُو میرا استقبال کرنے کے بجائے مجھ سے اپنا استقبال کروانا چاہتا ہے۔ کمرے میں بٹھانے کا مطلب یہی ہوا کہ جب تُو وہاں آئے گا تو مجھے بہر تعظیم اٹھ کر تجھے خوش آمدید کہنا پڑے گا....''

اس نے سر جھٹک کر سوچا۔ ''تُو نے اچھی چال چلی مگر افسوس ...میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ تُو استاد ہے تو میں بھی استادوں کے سر پر ناچنا جانتی ہوں۔''

پھر اس نے معاون سے کہا۔ ''ہمیں پائیں باغ میں لے چلو...''

وہ حکم کی تعمیل کے لئے پائیں باغ کی طرف چل دیا۔ وہ اپنی کنیزوں کے ہمراہ اس کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔ پھولوں کی پُر بہار کیاریوں کے پار وہ سکندر اور بطلیموس کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ اولمپیاس کو اس طرف آتا دیکھ کر چونک گیا۔ آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے معاون سے بولا۔ ''میں نے کہا تھا' بیگم فیلقوس

کومندر کے بڑے کمرے میں بٹھایا جائے۔"

اس سے پہلے کہ ملازم کوئی جواب دیتا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "جہاں میزبان ... وہیں مہمان... میں نے سوچا' وہاں کمرے میں تنہا بیٹھنے سے بہتر ہے' یہاں قابل استاد کی صحبت میں رہا جائے۔"

پھر وہ سکندر اور بطلیموس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے استقبال کے لئے نہیں آئے۔ لگتا ہے' کوئی خاص سبق یاد کر رہے تھے؟"

ان دونوں نے مسکرا کر سر جھکا لئے۔ ارسطو اولمپیاس کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ یہ جانتا تھا کہ وہ بہت ہی گھمنڈی اور نک چڑھی عورت ہے۔ اپنے آگے کسی کا سکہ چلنے نہیں دیتی۔ ارسطو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "علمی میدان کا ہر سبق خاص ہوتا ہے۔"

وہ ایک ذرا بے نیازی سے بولی۔ "میں علم کی اہمیت کو سمجھتی ہوں' اسی لئے تجھے اپنے پاس بلانے کے بجائے خود یہاں چلی آئی ہوں۔ ایک عالم فاضل استاد کی کیسے قدر کی جاتی ہے' یہ اچھی طرح جانتی ہوں۔"

وہ بولا۔ "قدردان صرف وہ نہیں ہوتا، جو ہمارے پاس خود چل کر آتا ہے۔ قدردان تو وہ بھی ہوتا ہے' جو ہمیں اپنے پاس بلاتا ہے۔"

وہ شانے اچکا کر بولی۔ "یہ تو کچھ عجیب سی بات ہوئی۔ بھلا ایک قابل شخص کو حکماً اپنے پاس بلانے والا قدردان کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "شاہ فیلقوس میرا بہت بڑا قدردان ہے۔ اس نے مجھے یونان سے میزا بلایا اور میں چلا آیا... کیا اس کی یہ قدردانی غلط ہے؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "نہیں۔ یہ بات الگ ہے۔"

"کوئی بات الگ نہیں ہوتی۔ بات سے بات بنتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے' پہلے تولو پھر بولو...."

اس نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے دونوں شاگردوں کو ایسے دیکھا' جیسے نگاہوں ہی



نگاہوں میں انہیں سبق پڑھا رہا ہو۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اولمپیاس نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تُو یہاں خوش ہے؟"

وہ بولا۔ "میں علم کے دریا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ فیلقوس نے مجھے سمندر دے دیا ہے، جہاں انسان کی سب سے اہم ضرورت پوری ہوتی رہے' وہاں وہ کیسے خوش نہیں رہے گا؟"

بیٹے پر اس فلسفی اتالیق کا اچھا خاصا رنگ چڑھ چکا تھا۔ وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ دونوں شاگرد ارسطو کے حکم کے مطابق وہاں سے چلے گئے۔ وہ اولمپیاس کے ساتھ عمارت کی طرف جانے لگا۔ ایسے ہی وقت وہ رک گئی۔ باغیچے کے فوارے کو دیکھ کر ایک ذرا تعجب سے بولی۔ "ارے... اتنا خوبصورت فوارہ خشک پڑا ہے؟"

وہ بولا۔ "خشک کہاں ہے؟ اس کے احاطے میں پانی کا ذخیرہ موجود ہے۔"

"فوآرے کی اصل خوبصورتی اس کے دہانے سے نکلنے والی تیز پھوہار سے ہوتی ہے۔ تُو نے اسے جاری کیوں نہیں کرایا؟"

"کیونکہ میں اس کی خوبصورتی سے زیادہ ان چرند و پرند کی ضرورت کو اہم سمجھتا ہوں' جو اس کے کنارے بیٹھ کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ جبکہ فوآرے کی پھوہار کھیت کے رکھوالے کی طرح انہیں دور بھگاتی رہتی ہے۔"

اتنی سی دیر میں پتہ چل گیا کہ ارسطو کا ہر جواب، لاجواب کر دیتا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہی تھی۔ مگر اپنی فطرت کے مطابق چاہتی تھی کہ اس کی شخصیت اس پر حاوی نہ ہو۔ وہ اس کی باتیں ایسے سن رہی تھی' جیسے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا رہی ہو۔ وہ باتیں کرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آ گئے۔ وہاں پریوں کے بے شمار خوبصورت مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ نیلگوں پتھروں سے تراشے گئے وہ دیوقامت مجسمے سنگ تراشی کے اعلیٰ ترین نمونوں میں سے تھے۔

وہ ان مجسموں کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔ پھر ارسطو کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''یہ پریاں کتنی حسین ہوتی ہیں۔ ہے نا...؟''

''ان کی خوبصورتی سنگ تراش کے ہاتھوں کی مرہونِ منت ہے۔ وہ چاہتا تو انہیں بدصورت اور بے ڈھنگی بھی بنا سکتا تھا۔''

وہ ایک مجسمے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''پریاں بدصورت نہیں ہوتیں۔''

''کیا تو نے انہیں دیکھا ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''دیکھا نہیں ہے۔ مگر یقین ہے، یہ بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔''

''ہمیشہ آنکھوں دیکھی چیز پر یقین رکھنا چاہئے۔''

اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا تو نے انہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں، جس ہستی کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، بھلا وہ کیسے دکھائی دے سکتی ہے؟''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا تُو ان کے وجود کا منکر ہے؟''

اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ تائید میں سر ہلا دیا۔ اولمپیاس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا شخص تھا، جو پریوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''اگر ان کا کوئی وجود نہیں ہے تو پھر انہیں شکل میں کیسے ڈھالا گیا؟ انہیں کیسے تراشا گیا؟''

''انسانی سوچ... انسانی خیالات بہت سی من گھڑت چیزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ مجسمے ایک سنگ تراش کی تخلیقی صلاحیتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔''

وہ کبھی اسے اور کبھی پریوں کے مجسموں کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''میں نے یوری پائیڈیز کے ڈراموں میں میڈیا کو پڑھا ہے۔ وہ بہت زبردست ساحرہ تھی۔ لیکن اسے کبھی کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ کیا وہ شہزادی بھی تیرے خیال میں



ایک من گھڑت کردار ہے؟''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ بالکل ایسے ہی، جیسے یہ پریاں... مصنف ہو، مصور ہو یا سخت اور بھدے پتھروں کو خوبصورت مورتیوں میں ڈھالنے والا کوئی سنگ تراش ہو، یہ سب ہی تخلیق کار خیالوں کی دنیا میں گم رہتے ہیں اور طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ میڈیا بھی انسانی سوچ کی پیداوار ہے۔''

وہ اس غیر معمولی صلاحیتوں والی شہزادی کو مہرہ بنا کر آئی تھی مگر ارسطو اسے مصنف کی محض خام خیالی کہہ کر اولمپیاس کو مایوس کر رہا تھا۔ یعنی وہ میڈیا، جو اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی، ارسطو اس سے ایک ذرا متاثر نہیں تھا۔ اس نے ایک ذرا توقف سے پوچھا۔ ''دیوتا بھی ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ کیا تو ان پر بھی یقین نہیں رکھتا؟''

''دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ موجود ہیں۔''

''یہ تو دوغلی بات ہوئی۔ تُو ان کے وجود کا اقرار بھی کر رہا ہے انکار بھی...؟''

''اقرار اس لئے کر رہا ہوں کہ ان کے اختیار و اقتدار کو مانتا ہوں۔ انکار اس لئے کر رہا ہوں کہ دنیا کے کسی شخص نے انہیں مجسم نہیں دیکھا ہے۔''

''یعنی دیوتاؤں کے عظیم بت بھی من گھڑت تخلیق ہیں؟''

وہ بولا۔ ''مندروں میں رکھے ہوئے بت صرف ہمارا عقیدہ ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ وہ دیوتا ایسے ہوں گے، ویسے ہوں گے۔ پھر اسی سوچ کے مطابق انہیں مختلف شکلیں دے دی جاتی ہیں۔ دنیا میں کسی بھی دیوتا کا بت آسمان سے نہیں اترا۔ زمین سے نہیں پھوٹا۔ یہ سب انسانی ہاتھوں کی کاریگری ہے۔''

اولمپیاس نے دن کا آدھا حصہ اس درسگاہ میں گزارا۔ اس دوران یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ارسطو بہت ہی عجیب و غریب انسان ہے۔ ایسی الجھی ہوئی باتیں کرتا ہے کہ ان کا سرا پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ خود ہی اپنی باتوں کی تشریح کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو کوئی نا سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں تھی۔

اولمپیاس محسوس کرتی رہی تھی کہ وہ فلسفی بہت کم بولتا ہے۔ سکندر نے کہا۔ ''ہمارا

استاد ہر چیز کے طبعی اسباب معلوم کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ یعنی کیوں ہے سے پہلے وہ کیا ہے پر توجہ دیتا ہے۔"

اس مندر میں اور اس سے متعلقہ وسیع و عریض باغیچے میں عجیب و غریب سامان جمع کیا گیا تھا۔ کہیں رنگارنگ پتھروں کے انبار تھے۔ کہیں سیپیوں اور گھونگوں سے بھرے ہوئے صندوق رکھے تھے۔ کہیں بھٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ پانی کی چلمچیاں دھری ہوئی تھیں اور ان میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے مرتبانوں میں تتلیاں اور مختلف حشرات الارض بند کئے گئے تھے۔ سکندر نے اسے بتایا تھا کہ ارسطو انہیں ان تمام کیڑوں کے اعضاء اور ان کی جسامت کے متعلق بڑی تفصیل سے سمجھاتا رہتا ہے۔

وہاں مختلف درختوں کے پتے جمع کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے مردہ پرندے بھی دکھائی دے رہے تھے' جن کی کھالوں میں مسالہ بھرا گیا تھا۔ اولمپیاس بڑی حیرت سے ان تمام اشیاء کا جائزہ لے رہی تھی۔

سکندر نے کہا۔ "وہ ہمیں مچھلیوں اور ان کی مختلف نسلوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ سیپیاں اور گھونگے کیسے وجود میں آتے ہیں' یہ سمجھاتا ہے۔"

اولمپیاس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یعنی وہ استاد کم اور مچھیرا زیادہ ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "شروع شروع میں ہمیں بھی یہی لگتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اندازہ ہوا کہ علم طب حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے حیوانات و نباتات کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "بدبودار مچھلیوں کے قریب رہنا۔ زمین پر رینگنے والے چھوٹے بڑے کیڑوں مکوڑوں کو ہاتھ پر بٹھا کر ان کا جائزہ لینا۔ چھی چھی... یہ کیسی تعلیم ہے؟ کیا وہ تجھے ایسے معاملات میں الجھا کر تیرا وقت برباد نہیں کر رہا ہے؟"

پھر اس نے ارسطو کے پاس آ کر کہا۔ "میں نے سنا ہے' تُو سیاسیات پر بھی عبور رکھتا ہے۔ شاہ فیلقوس اکثر و بیشتر تجھ سے مشورے لیتا رہتا ہے۔ سکندر کو طب پڑھانا



ضروری نہیں ہے۔ تُو اسے علمِ سیاست اور نظم ریاست کی تعلیم دینا شروع کر دے۔"

وہ بولا۔ "جس طرح ایک کپڑا بُننے والا جانتا ہے کہ کس رنگ کا دھاگا پہلے اور کس رنگ کا بعد میں استعمال کرنے سے کپڑا خوشنما دکھائی دے گا؟ اسی طرح میں جانتا ہوں کہ شہزادوں کو کب' کیا اور کیسے پڑھانا ہے؟"

وہ پہلو بدل کر بولی۔ "ہُوں۔ اچھی بات ہے۔ لیکن .... میرا بیٹا اس سلطنت کا ولی عہد ہے۔ میں چاہتی ہوں' سکندر اور بطلیموس کو الگ الگ تعلیم دی جائے۔"

وہ ایک قدیم نوشتے کو اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان کا سبق ایک ہے' اتالیق ایک ہے۔ پھر تعلیم الگ الگ دینے کا مقصد کیا ہوا؟"

پھر وہ اولمپیاس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تُو یہ چاہتی ہے کہ سکندر اس درسگاہ سے لائق اور بطلیموس نالائق بن کر نکلے تو یہ میری تعلیم پر نہیں' ان دونوں کی ذہانت پر منحصر ہے۔"

وہ اس کے دوٹوک جواب پر تلملا کر رہ جاتی تھی۔ لیکن اپنی ناگواری ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ بیٹے کا مستقبل اس فلسفی کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنی سوچ کے مطابق یہ سمجھ رہی تھی کہ اسے بدظن کرے گی تو ممکن ہے وہ دشمنی کے طور پر سکندر کو الٹی سیدھی تعلیم دینا شروع کر دے۔

محل میں آرسی نوئی بے چین تھی۔ شاہ فیلقوس اس کی خوابگاہ میں آیا تو اس نے کہا۔ "میں نے سنا ہے' اولمپیاس اس یونانی اتالیق سے ملنے کے لئے میزا گئی ہے؟"

اس نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "میرا بیٹا بھی اس مندر میں ہے۔ تُو نے اولمپیاس کے ساتھ مجھے وہاں کیوں نہیں بھیجا؟"

"سمجھا کر... ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رکھی جاتیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ وہ آج گئی ہے۔ میں کل وہاں جاؤں گی۔"

اس نے کہا۔ "ضروری نہیں ہے۔"

"کیوں...؟ جب اس سوکن کا وہاں جانا ضروری ہے تو میرا جانا ضروری کیوں

نہیں ہے؟''

''تُو اس کا مزاج جانتی ہے۔ وہ بال کی کھال نکالنے والی عورت ہے۔ خوامخواہ ہر ایک پر رعب جمانے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ ارسطو کی تعلیمی قابلیت کو اپنے طور پر جانچنے گئی ہے بے وقوف...!''

وہ بولی۔ ''یہی تو میں کہہ رہی ہوں' اس کے مزاج کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ناگن عورت بہت زہریلی ہے۔ ڈسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ وہ ضرور اس اتالیق کو سمجھانے گئی ہوگی' یہ پٹی پڑھانے گئی ہوگی کہ وہ سکندر پر زیادہ اور بطلیموس پر کم توجہ دیا کرے۔''

وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''میں تیرا یہ وہم دور نہیں کرسکتا۔ بہتر ہے' تُو کل میزا چلی جا۔''

اس کی اجازت حاصل کرکے وہ مطمئن ہوگئی۔ پھر ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''اولمپیاس کو اس محل میں آئے سترہ برس گزر گئے ہیں۔ تُو نے نہ تو اسے اپنی ملکہ بنایا ہے' نہ کسی دوسری کو محل میں لایا ہے۔ کیا ملکہ کی جگہ خالی پڑی رہے گی؟''

وہ شراب کا جام اٹھا کر پینے لگا۔ پھر اسے خالی کرتے ہوئے بولا۔ ''دیر آید... درست آید...''

''کچھ زیادہ دیر نہیں ہو رہی ہے؟ اتنی دیر ہوگی تو مجھے ڈر ہے' اولمپیاس ہی تیری ملکہ نہ بن جائے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''تیرا یہ خوف بہت جلد دور ہو جائے گا۔''

اس نے متجسس ہو کر پوچھا۔ ''کیا کوئی نظر میں ہے؟''

وہ خلاء میں ایسے تکنے لگا' جیسے ایک آنکھ سے کسی انجانی ملکہ کا چہرہ تلاش کر رہا ہو۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو وہ صرف خیالوں میں رہتی ہے۔ جب سامنے آئے گی تو اسے فوراً ملکہ بنا کر محل میں لے آؤں گا۔''

شام کے بعد اولمپیاس واپس آگئی۔ شاہ فیلقوس نے اس کی خوابگاہ میں آتے



ہوئے کہا۔ ''ہوں... کیسا رہا میزا کا دورہ...؟''

وہ بولی۔ ''الجھ گئی ہوں۔ وہ یونانی فلسفی نہ جانے کس قسم کا انسان ہے؟ اس سے ملنے کے بعد ایسا لگ رہا ہے' جیسے اتالیق کے سلسلے میں تیرا فیصلہ غلط ہے۔''

یہ ہمیشہ ہی ہوتا آیا تھا۔ شاہ فیلقوس جب بھی کسی معاملے میں کوئی فیصلہ کرتا تھا تو اولمپیاس اپنی عادت کے مطابق اس میں کیڑے ضرور نکالتی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''میں ارسطو سے مطمئن ہوں۔''

''میرے خیال میں تجھے مطمئن نہیں رہنا چاہئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ذہین ہے۔ اس نامی گرامی اتالیق افلاطون کا شاگرد ہے مگر....''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''کمال ہے.... اس کی ذہانت کا اعتراف بھی کر رہی ہے اور کہتی ہے' اس سے مطمئن بھی نہیں ہے؟''

وہ بولی۔ ''میرے خیال میں' تجھے خود میزا جا کر وہاں کا جائزہ لینا چاہئے۔ اس کی تعلیم و تربیت ہمارے بیٹے کو ولی عہد کے بجائے مچھیرا بنا دے گی۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ کل آرسی نوئی بیٹے سے ملنے جا رہی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔''

اس نے ایکدم سے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر جلدی سے کہا۔ ''نہیں۔ تُو کل وہاں نہیں جائے گا۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''ارے۔ ابھی تو تُو نے کہا تھا کہ مجھے بچوں کی تعلیم کا جائزہ لینے کے لئے وہاں جانا چاہئے پھر....؟''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔ تجھے جانا چاہئے مگر آرسی نوئی کے ساتھ نہیں۔ ارسطو کیا سوچے گا؟ مقدونیہ کا شہنشاہ اپنی بیگم کے بجائے داشتاؤں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔''

دو برتن آپس میں ٹکراتے ضرور ہیں۔ فیلقوس کی حکمت عملی تمام بیویوں کو ایک

دوسرے سے دور رکھتی تھی۔ لیکن سوکنوں کے میدان میں ایسی رسہ کشی چلتی ہی رہتی تھی۔ وہ ایسے وقت ہمیشہ درمیانہ راستہ اختیار کرتا تھا۔ لیکن اس کی یہ مصلحت اندیشی بیویوں کو اس سے بدظن کر دیتی تھی۔

آرسی نوئی کو اپنی جاسوس کنیز کے ذریعہ جب یہ خبر ملی کہ شاہ فیلقوس اس کے ساتھ میزا جانا چاہتا تھا لیکن اولمپیاس کی مرضی کے مطابق اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے تو اسے بہت تکلیف پہنچی۔ ایسی صورتحال میں آرسی نوئی کو یقین ہونے لگتا تھا کہ فیلقوس شعوری طور پر تسلیم نہیں کرتا ہے، مگر لاشعوری طور پر اولمپیاس کو اپنی ملکہ بنا چکا ہے۔

❁.........❁.........❁

ارسطو تعلیم کے ساتھ ساتھ سکندر اور بطلیموس کو نت نئے تجربات سے بھی روشناس کراتا رہتا تھا۔ جب دن ڈھل جاتا تھا تو وہ اپنی مطالعہ گاہ سے نکل اپنے شاگردوں کے ساتھ باغ کی روشوں پر چہل قدمی کرنے لگتا تھا۔ ایسے وقت دن بھر کے امور پر نظر ثانی کی جاتی تھی۔ یہ جاننا ضروری ہوتا تھا کہ ان شہزادوں نے آج کیا پڑھا اور کیا سیکھا؟ وہ کوئی بھی سوال پوچھتا تھا تو سکندر کی بھرپور کوشش ہوتی تھی کہ وہ بالکل درست جواب دے کر اسے متاثر کر دے۔ یہ خصلت بھی اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ وہ اس موروثی فطرت کو مثبت انداز میں استعمال کرتا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ ارسطو حسب معمول دونوں شاگردوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ ایسے وقت اس کے دو معاون بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ارسطو بڑی دیر سے چپ تھا۔ سر جھکا کر ایسے چل رہا تھا، جیسے اپنے ایک ایک قدم کا بغور جائزہ لے رہا ہو۔ مندر کی خاموش فضا میں اس کی ایسی طویل خاموشی کسی نئے اور طوفانی سوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی۔ بطلیموس ایسے موقع پر بیزار ہو جاتا تھا۔ جبکہ سکندر اپنے استاد کی ایک ایک حرکت کو بڑی توجہ سے دیکھتا رہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ارسطو ان کی ذہانت کو آزمانے کے لئے کوئی نہ کوئی سوال پوچھنے والا ہے۔ اس دوران یہ جاننے کی بے چینی رہتی تھی کہ اس



کے سوال کی نوعیت کیا ہوگی؟ پھر یہی ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ''اگر تم کشتی میں سوار ہو کر کنارے سے دور چلے جاؤ اور ایسے وقت سمندر میں طوفان آجائے تو کیا کرو گے؟''

اس کا سراب بھی جھکا ہوا تھا اور نگاہیں بدستور اپنے قدموں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے نپے تلے انداز میں چل رہا تھا۔ اس کے سوال پر وہ دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ سکندر جواب دینے کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ درست جواب دینے کے لئے غور و فکر لازمی ہے۔ بطلیموس نے ذرا سوچنے کے بعد پوچھا۔ ''پہلے یہ تو معلوم ہو کہ میں سفر کرنے کی غرض سے کشتی پر سوار ہوا ہوں یا صرف تفریح کے لئے....؟''

ارسطو نے کہا۔ ''یہ تو بہتر سمجھ سکتا ہے۔''

سکندر نے کہا۔ ''استاد محترم کے سوال پر غور کر۔ کنارے سے دور ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بیچ سمندر میں ہیں۔ جہاں کوئی مددگار نہیں پہنچ سکتا اور ایسی صورتحال تب ہی پیش آسکتی ہے، جب ہم ضرورتاً بحری سفر کر رہے ہوں۔ کوئی تفریح کے لئے کنارے سے اتنی دور نہیں جاتا۔''

ارسطو نے قائل ہو کر اسے دیکھا۔ ایسے وقت اس کے معاون بھی سوچ بچار میں مصروف ہو جاتے تھے اور استاد کے سوال کا درست جواب ڈھونڈنے لگتے تھے۔

بطلیموس دوبارہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر حسب معمول جواب دینے کے سلسلے میں پہل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسی مصیبت میں گھبرانے کے بجائے دانشمندی سے کام لوں گا۔ سمندری طوفان تب ہی آتا ہے، جب سمندر کے عظیم دیوتا ہماری کسی نادانی پر ناراض ہوتے ہیں۔ میں انہیں رام کرنے کے لئے اپنی ہر قیمتی شے قربانی کے طور پر سمندر میں پھینک دوں گا۔ اس طرح میری جان محفوظ رہے گی۔ پھر اپنے ملاحوں کو بھاری انعام کا لالچ دیتے ہوئے یہ حکم دوں گا کہ وہ اپنی تمام تر ہنرمندی کے ساتھ کشتی کو ساحل تک لے جائیں۔ انعام کی کشش ان کے حوصلے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔''

وہ سب ہی استادِ محترم کی تقلید میں دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ ارسطو نے سر گھما کر سکندر کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تُو کیوں خاموش ہے؟''

اس نے خیالوں سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''تُو نے جواب نہیں دیا' ایسی صورتحال میں کیا کرے گا؟''

وہ بولا۔ ''محسوس کرنے اور کسی مصیبت کو عملی طور پر جھیلنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں اس وقت' اس پرسکون ماحول میں' اس ہموار زمین پر کھڑا رہ کر یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ طوفانی مصیبت سے بچاؤ کی کیا تدبیر کروں گا؟ اس وقت میرے حواس بجا ہیں' میں یقیناً کوئی بہتر تدبیر سوچ سکتا ہوں لیکن مصیبت کی اس گھڑی میں نہ جانے کیسے کیسے ہوش اُڑا دینے والے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے؟''

ارسطو بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا' اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''لہٰذا میں سمجھتا ہوں' جب طوفان سے دوچار ہوں گا' تب ہی سمجھ سکوں گا کہ بچاؤ کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

ارسطو نے خوش ہو کر اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب.... بہت خوب۔ تیرے جواب میں سچائی کا عنصر موجود ہے۔''

وہ اسے تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ گویا اپنے طور پر اس معاملے کو ختم کر چکا تھا۔ لیکن وہ دونوں یہ جاننے کے لئے بے چین تھے کہ ان میں سے کس نے اس کے سوال کا درست جواب دیا ہے؟ سکندر نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ ''استادِ محترم! یہ تو بتا دے' درست جواب کس نے دیا ہے؟''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے ایک ذرا لاپروائی سے بولا۔ ''مجھے کیا معلوم...؟ یہ سب کچھ تو طوفان کی کیفیت پر موقوف ہے۔ ہم حقیقتاً پیش آنے والی مصیبت کو اپنے اندازوں سے اور خیالی تدابیر سے دور نہیں کر سکتے۔''

اس کے ایسے جواب پر وہ دونوں جھنجلا کر رہ گئے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہاں تمہارے درمیان کوئی مقابلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہار اور جیت کا فیصلہ نہ مانگو۔ بس



اتنا سمجھ لو! جو بات حقیقت سے قریب ہو' وہی بہتر ہوتی ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ دونوں معاون بھی اس کے پیچھے پیچھے جانے لگے۔ سکندر اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ بطلیموس نے جھنجلا کر کہا۔ ''ہمارا استاد بھی عجیب انسان ہے۔ یہ تبلیغ نہیں کرتا' تعلیم نہیں دیتا' یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ ہم پڑھتے ہیں' وہ بالکل صحیح ہے۔ کہتا ہے' سوال کرو اور جب سوال کئے جاتے ہیں تو کہتا ہے' جواب مجھے معلوم نہیں....''

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا استاد گہرے راز کی طرح ہے۔ بڑی دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ہر الجھی ہوئی بات میں ہمارے سوالوں کے جواب چھپے ہوتے ہیں۔ بس غور کرنے کی ضرورت ہے۔''

بطلیموس نے پوچھا۔ ''کیا تُو سمجھ گیا ہے' اس نے ہم چاروں کے جوابوں میں کس کے جواب کو درست تسلیم کیا ہے؟''

سکندر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تجھے شرمندگی تو ہو گی دوست! مگر کیا کروں' تیری الجھن دور کرنا بھی ضروری ہے۔ استادِ محترم میرے جواب سے متاثر ہو کر گیا ہے۔ تُو نے سنا نہیں' اس نے کہا ہے' جو بات حقیقت سے قریب ہو' وہی بہتر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے وہ اس بات کا اعتراف کر چکا تھا کہ میرے جواب میں سچائی کا عنصر موجود ہے۔''

بطلیموس نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میدان چاہے تیغ زنی کا ہو یا علم کا... ایسے کچوکے لگتے ہی رہتے ہیں۔ اب ہمیں چل کر سونا چاہئے۔''

وہ بولتا ہوا' مسکراتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ بطلیموس اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسے وقت سکندر کے ایک ایک انداز میں اولمپیاس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہی چوٹ مارنے والا لہجہ تھا... وہی زہریلی سی مسکراہٹ تھی۔ چال میں بھی فتح کا ایسا سرور چھلک رہا تھا' جیسے اولمپیاس اپنی کسی سوکن کو پچھاڑ کر بڑے

غرور سے چلی جا رہی ہو۔

کچھ عرصہ پہلے سکندر نے بڑی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے بطلیموس کی جان بچائی تھی۔ اسے موت کے اندھیروں میں گم ہونے سے پہلے ہی زندگی کی اجالوں کی طرف کھینچ لیا تھا۔ ایک سوتیلے رشتے کی خاطر اس نے اپنی ماں کو بے وقوف بنایا تھا۔ سکندر نے جو احسان کیا تھا' بطلیموس اسے کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ لیکن عداوت کی جو آگ بچپن سے ان سوتیلوں کے دلوں میں سلگ رہی تھی' وہ اس احسان کی مدھم پھوہار سے بجھنے والی نہیں تھی۔

دوسرے روز آرسی نوئی بھی میزا پہنچ گئی۔ ارسطو اس وقت اپنے دیگر معاونین کے ساتھ قریبی جنگل میں گیا ہوا تھا۔ آرسی نوئی بیٹے کے ساتھ اس درسگاہ کا جائزہ لینے لگی۔ بطلیموس نے اسے وہ تجربہ گاہ بھی دکھائی' جہاں ارسطو اور اس کے معاون کسی نہ کسی تجربے میں مصروف رہتے تھے۔ آرسی نوئی نے متاثر ہو کر کہا۔ ''ہوں۔ یہ اتالیق تو بڑا لائق فائق ہے۔ اچھے شاگرد وہی ہوتے ہیں' جو اپنے استاد کی پرچھائیں بن کر رہتے ہیں۔ میں چاہوں گی' جس طرح ارسطو اپنے استاد افلاطون کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عزت' دولت اور شہرت کما رہا ہے' اسی طرح تو بھی اس اتالیق کی پرچھائیں بن جا۔''

وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''کیا بہت زیادہ پڑھنے لکھنے کے بعد مجھے ولی عہد تسلیم کر لیا جائے گا؟ کیا سلطنت مقدونیہ کی نیابت میرے ہاتھوں میں سونپ دی جائے گی؟''

بیٹے کی بات سن کر اس کا سر جھک گیا۔ وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں جاہل رہوں' یا بہت قابل بن جاؤں۔ ایک داشتہ کی اولاد ہونے کا داغ میری زندگی میں اندھیرے ہی پھیلاتا رہے گا۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''تو ایسا کیوں سوچتا ہے؟ میری ایک بات گرہ میں باندھ لے۔ صرف تخت و تاج میں ہی طاقت نہیں ہوتی' تعلیم بھی انسان کو بہت اونچے مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ پڑھے لکھے قابل شخص کے آگے شہنشاہ بھی سر جھکاتے ہیں اور تو دیکھ



ہی رہا ہے' شاہ فیلقوس سلطنت کے بہت سے معاملات میں ارسطو کے مدبرانہ مشوروں کا محتاج بن گیا ہے۔ تجھے اس فلسفی کی قابلیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اسی میں تیری کامیابی ہے۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''اونہہ کامیابی.... میں اس کی قابلیت سے کیسے فائدہ اٹھا سکتا ہوں' جبکہ اس کی ساری توجہ سکندر کی طرف رہتی ہے۔''

اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب...؟ کیا یہاں تیرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے؟''

''اقتدار میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ ذہین اتالیق یہ خوب جانتا ہے کہ یہاں کون سا کھوٹا سکہ ہے اور کون کھرا...؟ وہ کھل کر نہیں بولتا۔ لیکن میں سب سمجھتا ہوں' لفظوں کی ہیرا پھیری سے وہ سکندر کی تعریفیں کرتا رہتا ہے' اس پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور وہ اپنی ماں کی طرح مغرور ہوتا جا رہا ہے۔''

یہ بڑی تشویشناک صورتحال تھی۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ''میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ ایک ولی عہد کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ کل وہ سوکن یہی دیکھنے آئی ہوگی۔ مگر میں یہ ناانصافی نہیں ہونے دوں گی۔ شاہ فیلقوس نے وعدہ کیا تھا' تم دونوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ اس سے تو محل جا کر بات ہوگی۔ ابھی اس فلسفی سے پوچھتی ہوں' وہ کس کے کہنے پر ایسا کر رہا ہے؟''

دن کے دوسرے پہر وہ واپس آیا تو اسے بتایا گیا کہ شاہ فیلقوس کی دوسری بیگم درسگاہ میں آئی ہوئی ہے۔ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ مندر کے بڑے کمرے میں آ گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد آرسی نوئی نے کہا۔ ''سکندر اور بطلیموس کی مائیں الگ ہیں۔ لیکن ان کا باپ ایک ہے۔ اس حوالے سے وہ دونوں ہی مقدونیہ کے شہزادے ہیں۔ رشتے اور رتبے میں برابر ہیں۔ پھر تو ان کے درمیان فرق کی دیوار کیوں کھڑی کر رہا ہے؟''

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں....؟''

"میں تجھ سے یہ نہیں کہوں گی کہ سکندر پر توجہ دینا چھوڑ دے۔بس اتنا چاہوں گی کہ جو سبق اسے پڑھایا جائے' وہی میرے بیٹے کو بھی پڑھایا جائے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔"اس درسگاہ کی چار دیواری میں وہ دونوں صرف میرے شاگرد ہیں۔نہ کوئی ادنیٰ ہے' نہ کوئی اعلیٰ ہے۔سگے سوتیلے کی رسہ کشی کو محل تک محدود رہنے دیا جائے تو بہتر ہوگا۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔مگر کیا کروں' جہاں اولمپیاس جیسی زہریلی سوکن ہو' وہاں محتاط رہنا پڑتا ہے۔"

وہ ایک ضخیم نوشتہ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔"سبق کا وقت ہو گیا ہے۔تُو میرے کسی بھی معاون کے ساتھ اس درسگاہ کا جائزہ لے سکتی ہے۔"

وہ اسے روکتے ہوئے بولی۔"تیری اس درسگاہ کو بہت اچھی طرح دیکھ چکی ہوں۔اب میری واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔جاتے جاتے بس ایک آخری بات کہنا چاہتی ہوں۔"

وہ پلٹ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔وہ بولی۔"میرا بیٹا ولی عہد نہیں بن سکتا مگر تیری طرح قابل انسان تو بن سکتا ہے۔میں چاہوں گی' وہ اس درسگاہ سے تیری پرچھائیں بن کر نکلے۔"

وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔پھر ایک ذرا توقف سے بولا۔"دنیا کا ہر بچہ دو بار جنم لیتا ہے۔ایک بار تب' جب ماں کے بطن سے باہر آکر دنیا کو دیکھتا ہے اور دوسری بار اس وقت' جب وہ ایک استاد کی شاگردی میں آکر اسی دنیا کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے۔اس طرح استاد کا درجہ بھی ماں کے برابر ہوتا ہے۔"

وہ کتابی باتیں کر رہا تھا۔آرسی نوئی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جواباً اس سے کیا کہے؟

وہ ذرا توقف سے بولا۔"میرا رشتہ میرے شاگردوں کے ساتھ ماں اور بچے کا ہوتا ہے۔تُو ہی بتا' کیا پیدا کرنے والی کوئی ماں اپنے کسی بھی بچے کو ممتا دینے کے سلسلے میں بخل سے کام لے سکتی ہے؟"



اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔وہ بولا۔"بس میری ایک بات یاد رکھ....ایک سنگ تراش کے لئے کسی بھی پتھر کو اپنی مرضی کی شکل میں ڈھالنا آسان ہوتا ہے لیکن ایک شاگرد کو اپنی پرچھائیں بنانا کسی بھی استاد کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔میں تو علم کا اجالا پھیلا رہا ہوں۔اب اگر سکندر آنکھیں کھول کر اس روشنی میں بہت کچھ دیکھ لیتا ہے اور بطلیموس کی نگاہیں چندھیانے لگتی ہیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

وہ پلٹ کر وہاں سے جانے لگا۔آرسی نوئی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ارسطو کی باتیں اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھیں۔اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ جاتے جاتے اس سوتیلے کی تعریف کرتا گیا ہے۔اس نے جل کر سوچا۔"بطلیموس درست کہتا ہے۔یہ اسی طرح سکندر کی تعریفیں کرتا رہتا ہوگا۔مجھے فیلقوس سے بات کرنی ہوگی یا تو ارسطو یہاں نہیں رہے گا یا پھر میں اپنے بیٹے کو واپس پیلا بلوالوں گی۔"

اس نے محل پہنچتے ہی شاہ فیلقوس سے بات کی تو اس نے کہا۔"ایک بات اچھی طرح سن لے۔بیٹوں کے تعلیمی سلسلے میں نہ تو میں تیری سنوں گا' نہ اولمپیاس کی۔میں نے بہت سوچ سمجھ کر ارسطو کا انتخاب کیا ہے۔وہ بہت ہی قابل اتالیق ہے۔"

"میں اس کی قابلیت پر شبہ نہیں کر رہی ہوں۔لیکن وہ ان بھائیوں کے درمیان عداوت پیدا کر رہا ہے۔"

"دنیا کا ہر استاد اپنے بہترین شاگرد سے خوش رہتا ہے۔جب شمشیر زنی کی مشقوں میں بطلیموس اوّل نمبر پر آتا تھا تو اس کا استاد اس کی خوب تعریفیں کرتا تھا۔اگر سکندر پڑھائی میں تیز ہے تو بطلیموس فن سپاہ گری میں اس سے دو قدم آگے ہے۔اسے چاہئے کہ بھائی سے حسد کرنے کے بجائے اپنی ذہانت کو تیز تر بناتا رہے۔"

دونوں ہی بیگمات اس یونانی اتالیق سے خوش نہیں تھیں۔لیکن بادشاہ کے اٹل فیصلے کے آگے مجبور ہو گئی تھیں۔فیلقوس نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ آئندہ ان دونوں میں سے کوئی بیگم میزا کا رخ نہیں کرے گی۔بیٹوں سے ملاقات کے سلسلے میں

یہ طے پایا گیا کہ انہیں ہر دو ہفتوں کے بعد چھٹی ملا کرے گی اور وہ تین روز کے لئے محل میں آیا کریں گے۔

سکندر کتابوں کا رسیا تھا۔ ارسطو کے زیر نگرانی آنے کے بعد اسے نئے اور معلوماتی نوشتے پڑھنے کا موقع مل رہا تھا۔ پھر تجربہ گاہ میں نت نئے تجربے اس کے دماغ کے دروازے کھول رہے تھے۔ وہ جیسے سونا تھا اور ارسطو کی صحبت میں کندن بن رہا تھا۔ وہ درسگاہ کے تعلیمی ماحول سے ایک دن کے لئے بھی دور ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اپنے چہیتے گھوڑے بیوسی فالس پر سواری کا شوق ایسا تھا کہ وہ ہر دوسرے ہفتے محل جانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

اس روز بھی وہ دونوں محل کی طرف جا رہے تھے۔ تقریباً آدھا راستہ طے ہو چکا تھا۔ بطلیموس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے' تھوڑی دیر ستانے کے بعد مزید سفر کیا جائے۔''

وہ ایک سرسبز جنگل سے گزر رہے تھے۔ سکندر نے بھی اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے محسوس کیا ہے' تُو مستقل سواری نہیں کر پاتا۔ بہت جلد تھک جاتا ہے۔''

وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترتے ہوئے بولا۔ ''تیرا اندازہ بالکل غلط ہے۔ دراصل میں تھکنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تھکن سے پہلے آرام کر لیتا ہوں۔''

وہ بھی گھوڑے سے اتر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں آتے ہوئے بولا۔ ''تیری یہ منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔''

وہ اپنے گھوڑے کو دوسرے درخت کے تنے سے باندھتے ہوئے بولا۔ ''منطق نہیں ہے دوست! یہ شاہانہ انداز ہیں۔''

سکندر بیوسی فالس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے گھوڑے پر بیٹھتا ہوں تو اترنے کو دل نہیں کرتا۔ بس جی چاہتا ہے' اس کے مضبوط جسم پر سوار ہو کر ہواؤں سے باتیں کرتا رہوں۔''



بطلیموس ہری بھری گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ درخت کے موٹے تنے سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''مجبوری ہے۔ سفر کی طوالت بڑھانے کے لئے پیلا کو میزا سے دور نہیں کیا جا سکتا۔''

وہ بھی اپنے گھوڑے کو باندھ کر دوسرے درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ پیلا کو دور نہیں کیا جا سکتا لیکن سفر طویل کرنے کے لئے راستہ تو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ تیری یہ تجویز قابل غور ہے۔''

وہ بڑے اشتیاق سے بولا۔ ''اگر ہم اس جنگل کے بجائے اُس ندی والے راستے سے محل کی طرف جائیں تو تقریباً کئی کوس کا فاصلہ بڑھ جائے گا۔ یعنی گھڑ سواری کا مزہ آ جائے گا۔''

بطلیموس سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''یار! گھوڑوں اور کتابوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں... تُو ان کے بارے میں کیوں نہیں سوچتا؟''

''کن کے بارے میں...؟''

''ہم دونوں جوان ہو چکے ہیں اور جہاں جوانی ہو وہاں پریم کہانی ضرور ہو۔''

وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''کوئی ضروری نہیں ہے۔''

''ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے۔ ویسے تُو بہت گہرا ہے۔ مجھے بتانا نہیں چاہتا۔ کوئی تو چھیل چھبیلی تیرے دل کو لگی ہو گی؟''

وہ بیزار ہو کر بولا۔ ''تُو پھر لڑکیوں کی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ کیا استاد محترم کا سبق بھول گیا ہے؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''بھولا تو نہیں ہوں مگر اس دل کا کیا کروں؟ یہ تو بس اسے مانگتا ہے۔''

سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زومائلہ وہاں میزا میں رہ گئی ہے۔ تین دنوں سے پہلے دیدار کی کوئی امید نہیں ہے۔''

وہ ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ”وہ پیچھے رہ گئی ہے تو کیا ہوا؟ آگے ہمارا محل ایسی رنگ برنگی تتلیوں سے بھرا پڑا ہے۔“

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”شاہی محلوں کی جوان داسیاں' نازک اندام کنیزیں ہم شہزادوں کے دل بہلانے کا سامان ہوتی ہیں۔“

وہ سر جھٹک کر مسکرانے لگا۔ بطلیموس نے کہا۔ ”اگر تیری زندگی میں واقعی اب تک کوئی نہیں آئی ہے تو کسی کو آنا چاہئے ورنہ تیری جوانی کو زنگ لگ جائے گا“

ایسے ہی وقت اوپر درخت کے پتوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ وہ دونوں ہی چونک گئے۔ سکندر سر اٹھا کر گھنے درخت کو دیکھنے لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ کچھ سمجھ پاتا' وہ پکے پکائے پھل کی طرح درخت سے ٹپک کر اس کی گود میں آگری۔ وہ ایکدم سے ہڑبڑا گیا۔ بطلیموس دیدے پھیلائے ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ منظر رنگین بھی تھا اور سنگین بھی....

ایک سنہری زلفوں والی من موہنی سی لڑکی آنکھیں میچے سکندر کی آغوش میں دبکی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے سے یوں لگایا ہوا تھا' جیسے سہم کر دل تھام لیا ہو۔ سکندر کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے ہکا بکا سا اسے تک رہا تھا۔ بطلیموس اپنی جگہ سے اٹھ کر اس حسین دوشیزہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کسی چڑیا کی طرح سہمی ہوئی تھی۔

سکندر نے سر اٹھا کر بطلیموس کو دیکھا۔ پھر پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ ک ک... کون ہے؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”گھبرا مت یار...! لڑکی ہے۔ تیرے لئے آسمان سے ٹپکی ہے۔ پہلی ملاقات میں دل لگتا ہے مگر یہ تو پوری کی پوری تجھ سے آ لگی ہے۔“

وہ الجھ کر بولا۔ ”یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“

بطلیموس آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے زلفیں ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے' یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔“



پھر وہ سکندر کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”تو ایسے ہاتھ پھیلا کر کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ کیا یہ چھوت کی بیماری ہے؟ اس کے چہرے کو تھپکنا چاہئے تاکہ یہ آنکھیں کھولے۔ میں پانی لاتا ہوں۔“

وہ دوڑتا ہوا قریبی چشمے کی طرف چلا گیا۔ سکندر نے ایک ذرا ہچکچا کر اس اجنبی حسینہ کو دیکھا۔ پھر اس کے گورے گلابی گال کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”اے...! اٹھو.... آنکھیں کھولو....“

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پل بھر کے لئے نگاہیں چار ہوئیں۔ پھر اسے ہوش آ گیا۔ وہ ایک اجنبی نوجوان کو اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی۔ فوراً ہی اچھل کر اس کی آغوش سے نکل گئی۔ سکندر اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔ وہ بکھری بکھری' سہمی ہوئی سی لڑکی کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اجلے چہرے پر سنہری زلفیں ایسے لہرا رہی تھیں' جیسے سورج کی کرنیں حسن کی دیوی سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں۔

سکندر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”تُو کون ہے....؟“

وہ اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے بولی۔ ”مم... میں سنبوری ہوں....“

”سنبوری....؟ اچھا نام ہے۔“

ایسے ہی وقت وہ چونک گئی۔ پریشان ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ پھر زمین پر ادھر ادھر ایسے دیکھنے لگی' جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ سکندر نے پوچھا۔ ”کیا ڈھونڈ رہی ہے؟“

اس نے پریشان ہو کر کہا۔ ”وہ... میری ٹوکری....؟“

پھر اس نے سر اٹھا کر درخت کے گھنے پتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اوہ.... میں نیچے آ گئی اور وہ اوپر ہی رہ گئی۔“

بطلیموس اپنی چرمی بوتل میں پانی لے آیا تھا۔ سکندر نے پوچھا۔ ”ویسے تُو اس درخت پر کیا کر رہی تھی؟“

وہ بولی۔ ”اس پیڑ پر جنگلی پھل لگتے ہیں۔ بہت ہی رسیلے اور ذائقے دار ہوتے

ہیں۔انہیں توڑنے کے لئے چڑھی تھی۔لیکن پاؤں پھسل گیا۔"

بطلیموس گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے تول رہا تھا۔اگرچہ وہ نوعمر تھا' لیکن حسن کے مول بھاؤ کو خوب سمجھتا تھا۔مسکراتے ہوئے بولا۔"کوئی بات نہیں۔اس عمر میں پاؤں پھسل ہی جاتے ہیں۔"

پھر وہ چرمی بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔"پانی پیئے گی...؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔سکندر نے کہا۔"اس جنگل ویرانے میں تنہا گھومتے تجھے ڈر نہیں لگتا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔"ڈر کس بات کا...؟ میں اس جنگل سے مانوس ہوں۔اس چھوٹی سی ندی کے اُس پار ہماری بستی ہے، میں وہیں رہتی ہوں۔"

پھر وہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔"ویسے تم دونوں کون ہو؟"

بطلیموس نے فخر سے سینہ پھُلا کر کہا۔"ہم شاہ فیلقوس کے بیٹے یعنی مقدونیہ کے شہزادے ہیں۔"

"مقدونیہ کے شہزادے....؟"اس نے شدید حیرانی سے دیدے پھیلا کر انہیں دیکھا۔ان کا قیمتی لباس اور شاہانہ انداز اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ اجنبی نوجوان درست کہہ رہا ہے۔پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔بطلیموس نے کن اکھیوں سے سکندر کو دیکھا۔وہ بڑی لگن سے سنبوری کو تک رہا تھا۔وہ اسے کہنی مارتے ہوئے بولا۔"کیوں دوست! ستانے کے لئے یہاں رکے تھے۔مگر اب تو لگتا ہے' تجھے راتوں کو بھی نیند آنے والی نہیں ہے۔"

اس نے شوخی سے مسکرا کر بطلیموس کو گھورا۔وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔چند لمحوں کے لئے اپنی قربت کی آنچ دینے والی دور ہونے کے بعد اسے پور پور سلگا رہی تھی۔وہ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی سے متاثر ہو رہا تھا۔سنبوری بطلیموس کی بات سمجھ نہیں پائی تھی۔لیکن شہزادے کی نگاہیں بہت کچھ سمجھا رہی تھیں۔سیدھی دل میں اترتی جا رہی تھیں۔اس نے ایک ذرا کترا کر نظریں جھکا لیں۔



بطلیموس نے سکندر کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔"اب سمجھ میں آ رہا ہو گا کہ استاد کا پڑھایا ہوا سبق کب اور کیسے دماغ سے اڑن چھو ہو جاتا ہے؟ اس لڑکی نے تو تیرے دل کے تار ہلا دیئے ہیں۔میں نے کہا تھا نا...' جہاں جوانی ہوتی ہے' وہاں پریم کہانی ضرور ہوتی ہے۔"

اس بار بات سمجھ میں آ گئی۔اس نے سر اٹھا کر سکندر کو دیکھا۔نگاہیں ایک بار پھر چار ہوئیں۔شہزادے کی میٹھی مسکراہٹ بطلیموس کی پیشگوئی کی تصدیق کر رہی تھی۔شرم کے مارے سنبوری کے پسینے چھوٹ گئے۔وہ نظریں جھکا کر دھڑکتے دل کے ساتھ سوچنے لگی۔"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کوئی شہزادہ کسی غریب کسان کی بیٹی پر کیسے عاشق ہو سکتا ہے؟"

اس نے کن اکھیوں سے سکندر کو ایسے دیکھا' جیسے اس کے چہرے پر اپنے سوال کا جواب ڈھونڈنا چاہتی ہو۔پھر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہاں سے پلٹ کر دوڑتی ہوئی ان سے دور جانے لگی۔بطلیموس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔"ارے...یہ تو بھاگ گئی۔"

سکندر نے کہا۔"وہ تیری باتیں سن کر شرما گئی ہے۔"

بطلیموس نے چیخ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"سن تو سہی....ہم تین روز بعد پھر یہاں سے گزریں گے۔میرا یہ یار تیرا انتظار کرے گا۔"

وہ دوڑتے دوڑتے رک گئی۔سکندر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔"کیوں بکواس کر رہا ہے؟"

بطلیموس کی نگاہیں سنبوری پر جمی ہوئی تھیں۔وہ پلٹ کر سکندر کو دیکھ رہی تھی۔پھر بڑی ادا سے مسکراتی ہوئی پلٹ کر دوڑتی چلی گئی۔بطلیموس فضا میں ایک مکا لہراتے ہوئے بولا۔"وہ مارا....تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔یہ تیرا انتظار ضرور کرے گی۔"

پھر اس نے سکندر کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بول...کیا میں بکواس کر رہا ہوں؟ کیا تُو اس کا انتظار نہیں کرے گا؟"

وہ اس سے کتراتے ہوئے بولا۔"میرا خیال ہے۔اب ہمیں چلنا چاہیئے۔"

وہ بولا۔ ''یوں کترانے سے بات نہیں بنے گی۔ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ تجھے ابھی فیصلہ کرنا ہوگا۔''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیسا فیصلہ....؟''

''اگر تُو اپنے مزاج کے مطابق اس سے کترائے گا تو مجبوراً مجھے آگے بڑھنا پڑے گا۔''

اس نے گھور کر پوچھا۔ ''کیا مطلب...؟ کیا تُو اس پر نیت خراب کر رہا ہے؟''

وہ مسکرا کر اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''ارے نہیں یار...! دیوتا نے اسے تیری گود میں پہنچایا ہے۔ وہ تیری ملکیت ہے۔ میں تو تیرا راستہ ہموار کرنے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تُو ہچکچاتا رہے گا تو تیرے دل کی بات مجھے اس کے دل تک پہنچانی پڑے گی۔ آئی بات سمجھ میں....؟''

سکندر اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنا پیغام محبوب تک پہنچانے کے لئے کسی نہ کسی کو وسیلہ بنانا ہی پڑتا ہے اور پھر تیرا یہ پہلا تجربہ ہے۔''

وہ سنہری دھوپ جیسی لڑکی سکندر کے دل کو بھا گئی تھی۔ مگر وہ اس سلسلے میں بطلیموس سے کوئی رائے مشورہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بھنورا صفت طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسی لئے کترا رہا تھا۔

اس نے بیوسی فالس پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ ''تجربہ وہی اچھا، جو خود کیا جائے۔ ویسے بھی دل کی بات کہنے کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے نگاہوں سے بہت کچھ کہہ دیا ہے اور وہ بہت کچھ سمجھ بھی گئی ہے۔ پھر بھی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہوگی تو میں خود اسے سمجھا دوں گا۔''

وہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''واہ میرے دوست! تُو تو چھپا رستم نکلا.....''

وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے بولا۔ ''رستم ہوں یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں



کہ دل کے معاملات میں گرمی سے نہیں...نرمی سے کام لیا جاتا ہے۔''

''کیا رینگ رینگ کر چلنا ضروری ہے؟ استادِ محترم کہتے ہیں' کل کا کام آج.... اور آج کا کام ابھی....''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گھوڑے کی رفتار بڑھاتا ہوا اس سے دور جانے لگا۔ بطلیموس تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر بڑی مکاری سے مسکرا کر اس طرف دیکھنے لگا' جس طرف سنبوری دوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ جانے والی پکے پکائے پھل کی طرح سکندر کی آغوش میں آ گری تھی۔ ایسی رس بھری تھی کہ بطلیموس اس کے لئے مچل گیا تھا۔

وہ بھی گھوڑے کو ایڑ لگا کر اسے دوڑاتا ہوا سکندر کے پیچھے جانے لگا۔ ایسے وقت سنبوری دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ ''میں ایسے معاملات میں نرمی کا قائل نہیں ہوں۔ آندھی طوفان کی طرح اپنے شکار پر جھپٹنا خوب جانتا ہوں۔''

پھر وہ ہنستے ہوئے زیرلب بولا۔ ''ہائے رے سکندر...! سنبوری کے سلسلے میں تیری کچھوے جیسی چال میرے لئے معاون ثابت ہوگی۔''

گویا ان کے درمیان ایک انار اور دو بیمار والا معاملہ ہو گیا تھا۔ محل میں آرسی نوئی اور اولمپیاس دونوں ہی اپنے اپنے بیٹوں کی منتظر تھیں۔ وہ جب بھی میزا سے لوٹتے تھے تو محل بھر میں جشن کا سا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ رقص اور موسیقی کی رنگا رنگ محفل جمتی تھی۔ محل کے گوشے گوشے کو تازہ پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ دونوں شہزادوں کو بارات کے دولہے کی طرح خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ استقبال کی ایسی رنگینیوں میں نوخیز اور چھیل چھبیلی کنیزیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ سب ہی ایک دوسری پر سبقت لے جانے اور شہزادوں کی نظروں میں جچنے کے لئے سوجتن سے تیار ہوتی تھیں۔

ایک کنیز بیدیاس نے حسن کی نوک پلک درست کرنے کے لئے آخری بار آئینے میں جھانکا تو اس کی سہیلی نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''بس کر.....اتنا دیکھے گی تو شہزادہ بطلیموس کے دیکھنے سے پہلے ہی میلی ہو جائے گی۔''

اس نے شوخی سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر آئینے کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''آج دیکھ رہی ہوں پھر تین روز تک اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ شہزادے کی نگاہیں میرا آئینہ بنی رہیں گی۔''

وہ سہیلی اس کے جُوڑے کا پھول درست کرتے ہوئے بولی۔ ''شہزادہ آتا ہے تو میں تجھ سے بات کرنے کو ترس جاتی ہوں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''اور وہ جاتا ہے تو میں دو ہفتوں تک اس کے لئے ترستی رہتی ہوں۔''

بیدیاس ان داسیوں میں سے تھی، جنہیں شہزادوں کی خدمت کے لئے مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ یہ طرح دار داسیاں حسن و دلکشی میں محل کی تمام کنیزوں سے برتر ہوتی تھیں۔ پھر جب ان سے بھی زیادہ جوان اور خوبصورت دوشیزائیں محل میں لائی جاتی تھیں تو پرانی داسیوں کو شہزادوں سے دور کر دیا جاتا تھا۔

بیدیاس پچھلے دو ماہ سے شہزادہ بطلیموس کی خدمت پر مامور تھی۔ سکندر کے لئے بھی اولمپیاس نے راملا نامی ایک حسین و جمیل کنیز کا انتخاب کیا تھا۔ یہ خدمت گزار داسیاں شہزادوں کی خوابگاہوں سے ملحقہ کمروں میں رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ دو کنیزوں کو مددگار کے طور پر ان کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔

شہزادوں کو اس بات کی مکمل آزادی رہتی تھی کہ وہ ان کنیزوں کو جس طرح چاہیں اپنے مصرف میں لا سکتے ہیں۔ بطلیموس اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ جبکہ سکندر اپنے مزاج کے مطابق کنیزوں کے ہجوم سے دور رہنے کی کوششیں کرتا تھا۔ وہ انہیں صرف اپنی خدمت گزار سمجھتا تھا۔

اولمپیاس کو احساس تھا کہ سکندر سن بلوغت کو پہنچ چکا ہے۔ اس عمر میں کسی بھی جوان مرد کو خوبصورت لڑکیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹا محل سے باہر کسی اجنبی دوشیزہ کی زلفوں کا اسیر ہو جائے۔ وہ باہر والی نہ جانے کیسے مزاج کی حامل ہوگی؟ کہیں بیٹے کو ماں سے بدظن نہ کر دے۔ یہ ایک ماں کی فطری



سوچ تھی۔

اولمپیاس چاہتی تھی کہ بیٹے کے قریب آنے والی وہی ہونی چاہئے، جسے وہ اچھی طرح جانتی ہو۔ محل کی تمام داسیاں اس کی جانی پہچانی تھیں۔ پھر بیٹے کے لئے مقرر کردہ داسی تو اس کی معمولہ اور تابعدار تھی۔ لہٰذا وہ راملا کو سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ شہزادے کے قریب رہنے کی کوشش کیا کرے تاکہ وہ کسی ایری غیری کی طرف بھٹکنے سے محفوظ رہے۔

لیکن سکندر جب تک محل میں رہتا تھا۔ راملا کے ذریعہ اولمپیاس کو یہی خبر ملتی رہتی تھی کہ شہزادے کے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے۔ وہ رومانوی جذبات سے بے نیاز ہے۔ رات رات بھر مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہے۔ وہ کھلی کتاب بن کر اس کے سامنے آتی ہے، تب بھی اسے توجہ سے نہیں دیکھتا۔ ہاتھ لگانا تو دور کی بات... اس کی آہٹ پر سر بھی نہیں اٹھاتا ہے۔ اسے صرف اور صرف ایک داسی سمجھتا ہے۔ اس سے آگے کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔

وہ ایسی خبروں سے پریشان ہو جاتی تھی۔ دل و دماغ میں یہ سوال کلبلانے لگتا تھا کہ آخر وہ راملا جیسی بھرپور لڑکی سے متاثر کیوں نہیں ہوتا ہے؟ جبکہ بطلیموس اور بیدیاس کے چرچے محل بھر میں گردش کرتے رہتے تھے۔ اس نے حیلے بہانے سے بیٹے کو کریدنا چاہا لیکن وہ ایسے کترا گیا، جیسے اس موضوع پر بات ہی نہ کرنا چاہتا ہو۔ اس کا ایسا انداز اسے مزید اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا کر دیتا تھا۔

اس روز بیٹے کی آمد سے پہلے اس نے راملا کو بلا کر کہا۔ ''میں تجھے آخری موقع دے رہی ہوں۔ اس بار بھی ناکامی ہوئی تو اپنا بوریا بستر لپیٹ کر محل سے دفع ہو جانا۔''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''میں تو پوری کوشش کرتی ہوں مگر....''

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''اب کوئی اگر مگر نہیں چلے گی۔ میں نے ٹھونک بجا کر تجھے شہزادے کی کنیز خاص بنایا تھا۔ تُو ہر لحاظ سے بھرپور ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں، میرے بیٹے کے سامنے تیری ساری ادائیں پھیکی پڑ جاتی ہیں؟ اور ذرا اس بیدیاس کو

دیکھ...! بطلیموس کیسے اسے دن رات اپنے ساتھ لگائے پھرتا ہے؟ وہ اپنے کمرے میں کم اور اس کی خوابگاہ میں زیادہ وقت گزارتی ہے۔''

راملا نے ایک ذرا شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ حسن و دلکشی میں بیدیاس سے دو قدم آگے تھی۔ لیکن شہزادے کی منظورِ نظر بننے کے سلسلے میں اس سے کئی قدم پیچھے رہ گئی تھی۔ پچھلی بار جب سکندر محل میں آیا تھا تو اولمپیاس نے اس سے پوچھا تھا۔''کیا تجھے راملا اچھی نہیں لگتی؟''

وہ بولا۔''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بہت اچھی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ لیکن...''

''لیکن کیا....؟''

''اس میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ ایک تو ادائیں بہت دکھاتی ہے اور دوسرے لباس کے معاملے میں بہت لاپرواہ ہے۔ ایسے مہین ملبوسات پہنتی ہے کہ نظریں جھکا کر بات کرنی پڑتی ہے۔''

راملا کے تمام ملبوسات اولمپیاس ہی منتخب کرتی تھی۔ وہ بولی۔''یہ اس کی خامیاں نہیں... خوبیاں ہیں۔ وہ صرف خدمت گزار نہیں ہے۔ تیرا دل بہلانے کا سامان بھی ہے۔''

وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔''میرا دل بہلانے کے لئے میری کتابیں ہی کافی ہیں۔''

بیٹے کے ایسے روّیے پر وہ تلملا کر رہ جاتی تھی۔ مگر اتنا ضرور جانتی تھی کہ بھڑکتی ہوئی آگ فولاد کو پگھلا دیتی ہے۔ اسے یقین تھا' راملا نہیں تو کوئی دوسری شعلہ بدن سکندر جیسے فولاد کو ضرور پگھلائے گی۔

راملا اس روز جیسے امتحان سے گزرنے والی تھی۔ اولمپیاس کے حکم کے مطابق وہ خوب سج دھج کر تیار ہوئی تھی۔ پھر بھی دل میں ناکامی کا خوف سمایا ہوا تھا۔ دوپہر کے بعد محل میں شہزادوں کی آمد کا شور مچ گیا۔ پھولوں کی بارش میں وہ اپنے گھوڑوں



سے اتر کر قدم بہ قدم چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچے، جہاں آرسی نوئی بیدیاس کے ساتھ اور اولمپیاس راملا کے ساتھ شہزادوں کے استقبال کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔

بطلیموس نے بڑی شوخی سے مسکرا کر بیدیاس کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر ماں کے گلے لگ گیا۔ دوسری طرف سکندر اولمپیاس سے گلے مل رہا تھا' اس کی دعائیں لے رہا تھا اور حسب معمول راملا کو نظر انداز کر رہا تھا۔

اولمپیاس نے بیٹے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔''تم دونوں دوپہر تک یہاں پہنچ جاتے ہو۔ آج آنے میں دیر کیوں ہوگئی؟''

سکندر نے ایک ذرا ہچکچا کر ماں کو دیکھا۔ بطلیموس نے چہک کر کہا۔''وجہ تو بتائے گا یا میں بتاؤں؟''

اس نے گھور کر اسے دیکھا۔ پھر ماں سے کہا۔''جنگل میں ستانے کے لئے رکے تھے کہ آنکھ لگ گئی۔ اسی لئے دیر ہوگئی۔''

بطلیموس نے ذومعنی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔''ہاں۔ آنکھ ہی تو لگ گئی ہے۔''

اولمپیاس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔''جنگلوں ویرانوں میں زیادہ دیر نہ رُکا کرو۔ ان بیابانوں میں جّن اور بھوتوں کے ڈیرے ہوتے ہیں۔''

بطلیموس نے مسکرا کر کہا۔''میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن آج پتہ چلا جنگلوں میں پریاں بھی رہتی ہیں۔''

اولمپیاس نے ٹھٹک کر پوچھا''پریاں...؟''

سکندر نے اسے گھور کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر ماں سے کہا۔''یہ مذاق کر رہا ہے۔''

اولمپیاس نے سوچتی ہوئی نظروں سے بطلیموس کو دیکھا، پھر سر جھٹک کر راملا سے کہا۔''شہزادے کو اس کی خوابگاہ میں لے جاؤ۔ پہلے یہ نیند پوری کرے گا۔ پھر باتیں

ہوں گی۔''

بطلیموس نے سکندر کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے کتابیں تیری نیندیں اڑاتی رہی تھیں۔ اب وہ تجھے جاگتی آنکھوں سے خواب دکھاتی رہے گی۔''

اولمپیاس نے ایک بار پھر ٹھٹک کر بطلیموس کو دیکھا۔ اس کی ذومعنی باتیں جیسے اولمپیاس کی چھٹی حِس کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ''یہ کس کی بات کررہا ہے؟''

سکندر نے بوکھلا کر کہا۔ ''وہ... وہاں درسگاہ میں ایک بہت ہی خوبصورت سنہری مچھلی ہے۔ یہ... یہ اسی کی بات کررہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''وہ مچھلی نہیں... جل پری ہے۔''

اس نے ایک نظر اولمپیاس پر ڈالی۔ پھر بڑی شوخی سے مسکراتا ہوا سکندر کو معنی خیز انداز میں دیکھتا ہوا آرسی نوئی اور بیدیاس کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر بیٹے کو راملا کے ساتھ رخصت کرکے اپنی خوابگاہ میں آ گئی۔

بطلیموس کی باتوں نے اور بیٹے کے چور لہجے نے اسے ذہنی طور پر الجھا دیا تھا۔ وہ کمرے میں آکر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ ایسے وقت کانوں میں اس سوتیلے کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''ہاں۔ آنکھ ہی تو لگ گئی ہے.... آج پتہ چلا' جنگلوں میں پریاں بھی رہتی ہیں.....''

وہ زیرلب بڑبڑائی۔ ''کیا واقعی یہ مذاق ہے؟ لیکن آج سے پہلے تو بطلیموس نے کبھی ایسا مذاق نہیں کیا....؟''

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی۔ ''یہ جل پری کا کیا چکر ہے؟ کون سکندر کو جاگتی آنکھوں سے خواب دکھانے والی ہے؟ اس لڑکے نے تو مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ ہو نہ ہو' دال میں ضرور کچھ کالا ہے اور مجھے اس کالک تک پہنچنا ہوگا۔''

ادھر یہ پریشان تھی۔ اُدھر آرسی نوئی بے چین ہوگئی تھی۔ بیٹے کے ساتھ اس کی



خوابگاہ میں آتے ہوئے بولی۔ ''یہ تُو استقبالیہ پر کیا اول فول بولے جارہا تھا؟''

وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔ وہ بولی۔ ''میں دیکھ رہی تھی' سکندر تیری باتوں سے پریشان ہورہا تھا۔''

''سکندر ہی کیا... میں نے اولمپیاس کو بھی پریشان کردیا ہے۔ جس طرح تُو بے چین ہوگئی ہے۔ اسی طرح وہ میری باتوں کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے اپنی خوابگاہ میں الجھ رہی ہوگی۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''سکندر بار بار تجھے ایسے دیکھتا تھا' جیسے کچھ چھپانا چاہتا ہو' آخر بات کیا ہے؟''

بیدیاس اس کے لئے پھل لے آئی تھی اور خود تازہ پھل کی طرح للچا رہی تھی۔ وہ اسے نظر بھر کے دیکھتے ہوئے ماں سے بولا۔ ''سب ہی جانتے ہیں' عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے....اور وہ نادان چھپانا چاہتا ہے۔''

آرسی نوئی نے شدید حیرت سے پوچھا۔ ''کون....؟ سکندر....؟ کیا اسے عشق ہو گیا ہے؟''

اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ ماں کے سوالوں کے جواب بھی دے رہا تھا اور ترچھی نظروں سے بیدیاس کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ریشمی لباس میں وہ جگہ جگہ سے جھلک رہی تھی' بھرے پیمانے کی طرح چھلک رہی تھی۔ بطلیموس ایک سیب اٹھا کر اسے ہاتھوں میں اچھالنے لگا۔ آرسی نوئی اپنی ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سکندر کو کسی سے عشق ہوگیا ہے۔

اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''لیکن وہ تو کتابوں کی دنیا سے باہر نہیں نکلتا ہے۔ محل میں یہ سب ہی جانتے ہیں کہ وہ راملا جیسی خوبصورت لڑکی سے بھی ایسے دور رہتا ہے' جیسے وہ چُھوت کی بیماری ہو۔ پھر اسے عشق کیسے ہوگیا؟''

وہ بولا۔ ''اولمپیاس چاہتی تھی کہ بیٹا محل سے باہر کسی سے آنکھ مٹکا نہ کرے، مگر افسوس... اس کی ساری تدبیر دھری کی دھری رہ گئی.... مقدونیہ کا ولی عہد ایک غریب

کسان کی بیٹی پر عاشق ہو گیا ہے۔"

"پھر تو وہ ضرور کوئی خاص ہوگی' جس نے سکندر جیسے لڑکے کو موم بنا دیا ہے؟"

سنبوری کے ذکر پر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ چہک کر بولا۔ "تُو نے حُوروں کی بے مثال خوبصورتی کے بارے میں سنا ہوگا۔ بس یوں سمجھ لے! آج میں نے اور سکندر نے اس بہشتی حسن کو دیکھ لیا ہے۔"

بیدیاس نے ایک ذرا ٹھٹک کر شہزادے کو دیکھا۔ آرسی نوئی نے پوچھا۔ "کیا واقعی وہ کوئی حور جیسی ہے؟"

وہ بولا۔ "اس محل میں سینکڑوں داسیاں اور الہڑ کنیزیں ہیں مگر ایک بھی اس کے ٹکر کی نہیں ہے۔"

اس کی بات سن کر بیدیاس جل بھن کر رہ گئی۔ آرسی نوئی نے ہنس کر کہا۔ "ارے کوئی راملا کو جا کر بتا دے۔ وہ بے چاری اس کتابی کیڑے کو متاثر کرنے کی فکر میں ہلکان ہوئی جاتی ہے۔"

پھر وہ ٹھٹک کر بولی۔ "اگر اولیمپیاس کو خبر ہو گئی تو وہ اس حُور کی جان لے لے گی۔"

وہ بولا۔ "اور یہی میں نہیں چاہتا۔ فی الحال اس زہریلی عورت کو الجھائے رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے سکندر کے تیور دیکھے ہیں، اسے پہلی بار کسی سے محبت ہوئی ہے۔ ایسے نئے نویلے عاشق محبوبہ کو بیوی بنانے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں' وہ خواب دیکھے اور اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے پیدا کرنے والی ماں سے محاذ آرائی شروع کر دے۔"

آرسی نوئی نے خوش ہو کر بیٹے کو دیکھا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یعنی تُو اُن ماں بیٹے کی تُو تُو ... میں میں سے چٹخارے لینا چاہتا ہے؟ اچھی بات ہے.... بہت دن ہوئے.... میں نے بھی اس ناگن عورت کو پھن پھیلا کر پھنکارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ماں بیٹے کا یہ تماشہ خوب رنگ جمائے گا...."



وہ بولتی ہوئی خوابگاہ سے باہر چلی گئی۔ ماں دور ہوئی تو محبوبہ آ کر پہلو سے لگ گئی۔ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس جنت کی حُور پر سکندر عاشق ہوا ہے یا تُو...؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "تجھے کیا لگتا ہے؟"

"میں نے تیری آنکھوں میں اس کے لئے چمک دیکھی ہے۔ سچ بتا! کیا وہ تیرے بھی دل کو بھا گئی ہے؟"

وہ ایک ہائے کے ساتھ بولا۔ "وہ ہے ہی ایسی....کوئی بدذوق ہی ہوگا' جو اس سے متاثر نہیں ہوگا۔ کم از کم میں ایسا نہیں ہوں، حُسنِ نظر رکھتا ہوں۔"

وہ تڑپ کر اس سے الگ ہو گئی۔ شکایتی لہجے میں بولی۔ "تیری نظر اتنی جلدی بدل جائے گی' میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

"ہر اچھی چیز اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پہلے تُو نے کھینچا۔ اب وہ کھینچ رہی ہے۔"

وہ بولی۔ "مگر ابھی تو تُو نے کہا تھا' سکندر اس پر عاشق ہو گیا ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ عشق انسان کی رفتار سست کر دیتا ہے۔ وہ اس کا عاشق ہے اور میں اس کا طالب ہوں۔ عشق کی سچائی ٹھہری ہوئی جھیل کی طرح ہوتی ہے۔ گہری اور خاموش.... جبکہ طالب کی شدت طوفانی ہوتی ہے۔ مطلوب تک پہنچنے میں ایک ذرا دیر نہیں لگاتی۔"

وہ اندر ہی اندر جل بھن رہی تھی۔ اس انجانی حسینہ کے بارے میں بڑے حسد سے سوچ رہی تھی۔ اس کے لئے شہزادے کا یوں آہیں بھرنا اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ وہ منہ بنا کر بولی۔ "دو ہفتوں سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ اب آیا ہے تو کسی سوکن محبوبہ کے قصیدے پڑھے جا رہا ہے۔ بھنورے کو جب تک رس ملتا رہتا ہے' تب تک وہ ایک ہی پھول پر بیٹھا رہتا ہے۔ مگر تُو تو اس سے بھی زیادہ ہرجائی نکلا۔"

وہ بڑی رکھائی سے بولا۔ "شہزادہ اور ہرجائی.... ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ شکایت نہ کر۔ ویسے بھی تیرے بعد کسی دوسری کو تو آنا ہی ہے۔"

اس کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ بطلیموس اس کی کنواری زندگی میں آنے والا پہلا

مرد تھا۔ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ صرف اس کی ملازمہ ہے' دل بہلانے کا سامان ہے۔ نیا کھلونا آتے ہی پرانے کو اٹھا کر محل سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ مگر اس دل کا کیا کیا جائے.... جو سراب کو دریا سمجھ کر پیاس بجھانے کی ضد کرنے لگتا ہے۔ وہ شہزادے کی آغوش میں اپنا سب کچھ ہارنے والی دل بھی ہار بیٹھی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ پانی پر اترنے والے چاند کا عکس صرف دکھاوے کے لئے ہوتا ہے...دور دور سے...چاند کبھی ہاتھ نہیں آتا۔

عکس ہی سہی....دل تو بہل رہا تھا۔ مگر سنبوری کے کنکر نے اس کے اندر ہلچل مچا دی تھی۔ وہ اس رات شہزادے کے پاس رہی۔ لیکن رات بھر نرم گرم بستر پر ایک سوکن کی چبھن اسے بے چین کرتی رہی۔ پھر صبح کی پو پھوٹنے سے پہلے ہی ایک خیال نے اس کے اندر اجالے سے بھر دیئے۔ اس کے کانوں میں آرسی نوئی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''اگر اولمپیاس کو خبر ہوگئی تو وہ اس حُور کی جان لے لے گی۔''

باہر درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اندر سے وہ شہزادے کی آغوش میں گنگنانے لگی۔

===✿===



بطلیموس نے سچ ہی کہا تھا' سکندر کو اب نیند آنے والی نہیں ہے۔ وہ واقعی جاگتی آنکھوں سے سنبوری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ رات گئے تک مختلف کتابوں میں سر کھپانے کا عادی تھا لیکن اس رات اس کا حسن کھلی کتاب بن گیا تھا۔ اس کی ہر سطر اتنی خوبصورت اور دلچسپ تھی کہ شہزادے کی دوسری تمام دلچسپیاں ہوا ہو کر رہ گئی تھیں۔

راملا ایک طرف بیٹھی کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے دور رہتا ہی تھا لیکن اس رات خلافِ معمول اپنی کتابوں سے بھی دور تھا۔ بستر پر لیٹا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا؟ راملا نے ایسے پہلو بدلا' جیسے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتی ہو۔ لیکن وہ وہاں ہوتا تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کو محسوس کر پاتا۔ وہ تو خود محل سے دور اس جنگل ویرانے میں بھٹک رہا تھا۔

راملا اس کی ایسی بے نیازی سے بری طرح مایوس ہو رہی تھی۔ ایسے وقت اولمپیاس کا حکم دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ ''میں تجھے آخری موقع دے رہی ہوں۔ اس بار بھی ناکامی ہوئی تو اپنا بوریا بستر لپیٹ کر محل سے دفع ہو جانا....''

وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ شہزادے کی بے حسی جیسے ٹھوکریں مار رہی تھی۔ اولمپیاس کے الفاظ ایک بار پھر کانوں میں گونجنے لگے۔ ''اب کوئی اگر مگر نہیں چلے گی۔ میں نے ٹھونک بجا کر تجھے شہزادے کی کنیز خاص بنایا تھا۔ تُو ہر لحاظ سے بھرپور ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرے بیٹے کے سامنے تیری ساری ادائیں پھیکی پڑ جاتی ہیں....؟''

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی سکندر کے پائنتی آ کر بیٹھ گئی۔ شہزادے کے خیالوں کی اڑان بہت اونچی تھی' وہ قدموں میں آ کر بیٹھنے والی کو دیکھ نہ سکا۔ ان لمحات میں سنبوری اس کے قریب آ رہی تھی۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی' بڑی اداؤں سے چلتی ہوئی اس کے پیروں کی طرف آ کر بیٹھ گئی۔ مدھم ہواؤں کے جھونکے اس کی سنہری زلفوں کو ادھر سے ادھر کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ سکندر نے کہا۔ ''کچھ تو بول...''

اس نے دھیرے سے کہا۔ ''کیا بولوں..؟ تُو میری سنتا ہی کب ہے؟''

اس کے لہجے میں ایک عجیب سی اداسی تھی۔ وہ بڑے پیار سے بولا۔ ''سننے کے لئے ہی تو آیا ہوں۔''

''کیا سچ....؟'' مارے خوشی کے اس نے سکندر کے پاؤں چھو لئے۔ ایسے ہی وقت وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ لمس خیالی نہیں تھا۔ پائنتی بیٹھی ہوئی راملا نے اسے چھو لیا تھا۔ وہ خوش ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً ہی پاؤں سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''تُو....؟ تُو یہاں کیا کر رہی ہے؟''

یوں چونک کر اٹھ بیٹھنے سے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ خیالات میں نہیں بھٹک رہا تھا اور کسی کے دھوکے میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ مایوسی سے سر جھکا کر بولی۔ ''وہ.... میں پاؤں دابنے آئی تھی۔''

''مجھے ضرورت نہیں ہے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر سو جا....''

اس نے تڑپ کر شہزادے کو دیکھا۔ پھر بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ اگر ابھی یہاں سے چلی گئی تو صبح ہمیشہ کے لئے محل سے نکال دی جاؤں گی۔''

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے



روتے کہنے لگی۔ ''میری ملازمت میرے بوڑھے اور بیمار ماں باپ کی زندگی ہے۔ دیوتا زیوس کا واسطہ ہے' مجھ پر رحم کر۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے بول رہی تھی۔ سکندر نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ''تُو ایک اچھی ملازمہ ہے۔ تجھے یہاں سے کون نکال رہا ہے؟''

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''میں ملازمہ تو بن گئی ہوں لیکن تیری داشتہ نہیں بن پائی ہوں۔ یہی میرا قصور ہے۔ اولمپیاس نے مجھے آخری موقع دیا ہے۔ اگر میں تجھے متاثر نہ کر پائی تو صبح .....''

اس کی آواز ہچکیوں میں بدل گئی۔ وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''تُو چاہے تو اس محل میں آج کی یہ رات میرے لئے آخری بھی ہو سکتی ہے اور....''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سکندر بستر سے اتر کر ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا۔ اپنے مزاج کے خلاف اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس غریب لڑکی کی روٹی روزی چھین لی جائے۔ اولمپیاس سے راملا کی وکالت کرنا بیکار تھا۔ وہ ضد کی پکی عورت اپنے فیصلوں پر اٹل رہتی تھی۔ ایسے وقت سکندر کسی نہ کسی دھوکے یا حکمت عملی سے ہی اسے قائل کر پاتا تھا۔ بطلیموس کو جب سانپ نے کاٹا تھا' تب بھی اولمپیاس اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ وہ اس سوتیلے کی زندگی بچانا نہیں چاہتی تھی۔ ایسے وقت سکندر کی حکمت عملی نے بطلیموس کو بچا لیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس کے ایک ایک انداز سے ارسطو کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ ٹہل نہیں رہا ہے' بلکہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ پھر ایک جگہ رکتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے مزاج کے خلاف نہیں چل سکتا اور اولمپیاس کو قائل بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود تجھے اس محل سے جانے نہیں دوں گا۔''

''وہ کیسے....؟''

وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ انداز ایسا تھا' جیسے کہہ رہا ہو۔ ''وہ میری ماں ہے تو

میں بھی اس کا بیٹا ہوں۔ بازی کو کیسے پلٹنا ہے' یہ خوب جانتا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "اولمپیاس کو مطمئن کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تُو اس کی خواہش کے مطابق اس بند کمرے میں میرے ساتھ راتیں گزارے گی مگر ہمارے درمیان فاصلہ رہا کرے گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ مجھے تیرے قریب لانا چاہتی ہے۔ اگر فاصلہ رہے گا تو....."

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "وہ بند کمرے کے اندر جھانکنے نہیں آئے گی۔ اس پر یہی ظاہر کیا جائے گا کہ ہم دونوں بطلیموس اور بیدیاس کی طرح وقت گزارتے ہیں۔ اس طرح وہ مطمئن ہو جائے گی۔"

اس نے قائل ہو کر کہا۔ "یعنی میں تجھ سے دور رہوں گی مگر اولمپیاس کو یہ یقین دلاتی رہوں گی کہ تیری منظورِ نظر بن گئی ہوں؟"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ "اس طرح نہ تیری ملازمت جائے گی' نہ مجھے اپنے مزاج کے خلاف کچھ کرنا پڑے گا۔"

دوسری صبح اولمپیاس نے راملا کو بلایا تو وہ شہزادے کے حکم کے مطابق چہکتی لہکتی ہوئی اس کے سامنے حاضر ہو گئی۔ وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہوں.... بہت خوش دکھائی دے رہی ہے؟"

وہ مسکرا کر سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "تُو میری خوشیوں کو سمجھ سکتی ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہے' تُو نے سکندر کو فتح کر لیا ہے؟"

اس نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ "یہ تو بہت زبردست خبر ہے۔"

پھر اپنے گلے سے موتیوں کی ایک مالا اتار کر اسے دیتے ہوئے بولی۔ "اگر اسی طرح کامیابی حاصل کرتی رہی تو ایسے انعامات سے مالا مال ہوتی رہے گی۔"

راملا اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ سکندر کی حکمت عملی کام کر گئی



تھی۔ اولمپیاس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے والی تھی کہ بیٹا گھر کے کھونٹے سے اٹکنے کے بعد باہر کہیں بھٹکنے نہیں جائے گا۔

دوپہر کے بعد سکندر اپنے لاڈلے گھوڑے بیوسی فالس پر سوار ہو کر محل سے جانے لگا تو اولمپیاس نے پوچھا۔ "کہاں جا رہا ہے؟"

وہ بولا۔ "بس ذرا ہوا خوری کے لئے جا رہا ہوں۔ ابھی آ جاؤں گا۔"

وہ سنبوری کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ رات بھر اس کی یاد میں جاگتا رہا تھا۔ ماں کی مزید کوئی بات سنے بغیر گھوڑا دوڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف جانے لگا۔ اولمپیاس نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ "ارے۔ سن تو سہی... اس بھری دوپہر میں کیسی ہوا خوری....؟"

وہ دروازے سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اولمپیاس سوچتی ہوئی نظروں سے ادھر دیکھتی رہی پھر پلٹ کر محل کے اندرونی حصے میں آ گئی۔ وہ کچھ الجھ سی گئی تھی۔ سکندر پہلے کبھی ہوا خوری کے لئے محل سے باہر نہیں گیا تھا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی ضرورت کے تحت ہی اس عالیشان چار دیواری سے قدم باہر نکالتا تھا۔ مگر اس وقت تو جیسے وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر گیا تھا۔ اس کی ایسی تبدیلی اولمپیاس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بیٹے کی عجلت نے ماں کو الجھا دیا تھا۔

وہ اس کے بارے میں سوچتی ہوئی اپنی خوابگاہ کی طرف جا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت بیدیاس نے اس کے قریب آ کر ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔ "اولمپیاس پر دیوتاؤں کا سایہ رہے۔"

وہ جس طرح سوتیلے رشتوں سے کتراتی تھی' اسی طرح ان کے ملازموں سے بھی دور رہتی تھی۔ فیلقوس نے محل میں ہر بیگم کا رہائشی حصہ مقرر کیا ہوا تھا۔ اس وقت وہ بطلیموس کی منظورِ نظر کو اپنے مخصوص حصے میں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ حقارت سے بولی۔ "تُو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں جانتی ہوں' محل کا یہ حصہ میرے لئے ممنوع ہے۔ مجھے تیری

اجازت کے بغیر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا مگر....''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اولمپیاس نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے اپنی ایک کنیز سے کہا۔ ''دوسرے گھر کا کچرا اڑ کر اپنے آنگن میں آجائے تو اسے فوراً صاف کر دینا چاہئے۔''

وہ کنیز سمجھدار تھی، اپنی مالکن کا حکم سمجھ گئی۔ بیدیاس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''چل یہاں سے...''

وہ اولمپیاس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تیرے مخالفین کی خدمت گزار ہوں مگر اس وقت تیرے لئے بہت ہی اہم خبر لائی ہوں۔''

اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں زہریلے سانپ پالنے کی شوقین ہوں۔ لیکن آستین کے سانپ مجھے زہر لگتے ہیں۔ میں مخالفین کی طرف سے کبھی کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھتی۔ بہتر ہوگا' اپنی خبر کے ساتھ یہاں سے چلی جا...''

بیدیاس نے کہا۔ ''اس خبر کا تعلق سکندر سے ہے۔''

اولمپیاس آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولی۔ ''کیا تُو جاننا نہیں چاہے گی کہ شہزادہ اس وقت کہاں گیا ہے؟''

اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا تُو جانتی ہے؟''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ جانتی ہوں۔''

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی قریب آ کر بولی۔ ''تو پھر بتا' وہ کہاں گیا ہے؟''

بیدیاس نے ایک ذرا ہچکچا کر اس کنیز کو دیکھا۔ پھر اولمپیاس سے کہا۔ ''بات راز میں رہے تو اچھا ہے...''

وہ پہلے ہی بیٹے کے بارے میں سوچ سوچ کر الجھ رہی تھی۔ ایسے میں بیدیاس نے اس کے تجسس کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ یہ جاننے کی بے چینی ہو گئی تھی کہ وہ شہزادے



کے بارے میں کیا خبر لائی ہے؟ وہ اسے اپنی خوابگاہ میں لے آئی۔ بیدیاس نے کہا۔ ''مجھے صرف اتنا تحفظ چاہئے کہ جب بات کھلے گی تو میرا نام نہیں لیا جائے گا۔ تُو کسی کو یہ نہیں بتائے گی کہ میں نے تجھے باخبر کیا تھا۔''

وہ بولی۔ ''ایسا ہی ہوگا، تجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ آگے بول.... میرے صبر کو نہ آزما۔''

بیدیاس نے گہری رازداری سے کہا۔ ''جو تُو نہیں چاہتی تھی' وہی ہو رہا ہے۔ سکندر کسی حسینہ پر عاشق ہو گیا ہے۔''

اولمپیاس نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ''کون ہے وہ....؟''

وہ اسے تمام واقعات اور حالات سے آگاہ کرنے لگی۔ اولمپیاس پوری تفصیل سننے کے بعد ناگواری سے بولی۔ ''محلوں کا شہزادہ ہو کر غریب کسان کی لڑکی سے دل لگا رہا ہے....''

وہ بولی۔ ''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں' وہ اس وقت اسی کے پاس گیا ہوگا۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر سوچنے لگی۔ پھر بیدیاس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی' تُو مجھے باخبر کرنے کیوں آئی ہے؟''

وہ بولی۔ ''تُو تو جانتی ہے' سوکن کا جلاپا بہت برا ہوتا ہے۔ سنبوری صرف سکندر کو ہی نہیں' بطلیموس کو بھی بھا گئی ہے اور اسی حسد کی وجہ سے میں تیرے پاس چلی آئی۔ کیونکہ تُو ہی سنبوری کا سدباب کر سکتی ہے۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہوں۔ میں سمجھ گئی۔ اب تُو جا سکتی ہے۔''

وہ عاجزی سے بولی۔ ''بطلیموس کو پتہ نہ چلے کہ میں یہاں آئی تھی۔''

''کہہ دیا نا... تُو نہیں مرے گی۔ جا... دفع ہو جا....''

وہ بیدیاس کو رخصت کر کے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بیٹے کو عشق و محبت کے جھمیلوں سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ گویا جوانی کے آوارہ بادلوں کو مٹھی میں جکڑ کر رکھنا چاہتی تھی۔ مگر تمام تر حکمت عملیوں کے باوجود یہ خبر مل رہی تھی کہ وہ بادل پانی بن کر

اس کی مٹھی سے نکل گیا ہے۔

اس نے اپنے ایک خاص ملازم کو بلا کر تمام صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ اس جنگل میں جائے اور شہزادے پر کڑی نظر رکھے۔ یہ معلوم کرے کہ وہ لڑکی کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے اور کہاں رہتی ہے؟

دوسری طرف سکندر بے خبر تھا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پہلے پہلے عشق کا چرچا ماں کے کانوں تک پہنچ چکا ہے۔ وہ اس مخصوص درخت کے پاس پہنچا تو وہاں سنبوری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ گھوڑے سے اترتے ہوئے بولا۔ ''تُو... تُو یہاں کیا کر رہی ہے؟''

وہ مسکرا کر' ذرا شرما کر بولی۔ ''تیرا انتظار...''

''مگر میں تو آج سے دو دن بعد یہاں آنے والا تھا۔''

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ''ایسی بات ہے تو ابھی یہاں کیا کرنے آیا ہے؟''

وہ ذرا ہچکچا کر بولا۔ ''وہ... میں تو ہوا خوری کے لئے آیا ہوں۔''

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ ''تُو سچ بولے گا تو مجھے اچھا لگے گا۔''

وہ سچ بولنے کی فرمائش کر رہی تھی جبکہ وہ کترا رہا تھا۔ یہ کیسے بتاتا کہ رات سے صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا ہے۔ پہلی ملاقات نے ایسی تڑپ پیدا کر دی تھی کہ دوسری ملاقات کی کشش رات بھر جگاتی رہی تھی۔ وہ پہلی بار کسی لڑکی سے متاثر ہو رہا تھا اور یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ دل کا حال کیسے بیان کیا جاتا ہے؟

وہ اندر ہی اندر الجھ رہا تھا۔ سنبوری نے کہا۔ ''دراصل ہم دونوں ہی امید کی انگلی تھام کر اس جنگل میں آئے ہیں۔ میرا بابا کہتا ہے' لگن سچی ہو تو منزل ضرور ملتی ہے۔''

وہ بولا۔ ''تیرا بابا سچ کہتا ہے۔ میں تجھ سے ملنے کی امید میں یہاں آیا تھا اور دیکھ لے... ملاقات ہو گئی۔''

وہ محبت کی اڑان بھرنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ ظالم سماج ان کے پَر کاٹنے



کی تیاریاں کر چکا ہے۔ وہ آس پاس کی دنیا سے بے خبر تھے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چور آنکھیں اس ویرانے میں بھی ان کی چوری پکڑ سکتی ہیں۔ اولمپیاس کا ملازم ایک درخت کی آڑ سے طوطا مینا کی اس جوڑی کو دیکھ رہا تھا' ان کی میٹھی بولیاں سن رہا تھا۔ سنبوری کہہ رہی تھی۔ ''میں زمین پر رہ کر آسمان کے خواب تو دیکھ سکتی ہوں... یہ اچھی طرح جانتی ہوں' اسے کبھی چھو نہیں سکوں گی۔''

وہ بولا۔ ''میں تیرے خوابوں کو تعبیر دوں گا۔ یہ سچ ہے' دنیا کا کوئی شخص بلندی سے پستی کی طرف آنا نہیں چاہتا لیکن یہ آسمان تیرے لئے جھک جائے گا۔''

اولمپیاس کا وہ مخبر بہت ہی مستعد تھا۔ اس نے سکندر کے محل میں پہنچنے سے پہلے ہی سنبوری کے متعلق تمام تفصیلات اولمپیاس تک پہنچا دیں۔ بیٹے کے عشق کی تصدیق نے اسے شعلہ فشاں بنا دیا تھا۔ وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھ نہیں رہی تھی۔ کبھی خوابگاہ میں' کبھی محل کے دوسرے حصوں میں ایسے ٹہلتی پھر رہی تھی' جیسے پاؤں تلے انگارے بجھ گئے ہوں۔ وہ بڑی بے چینی سے سکندر کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ وہ عاشق بیٹا واپس آئے گا' تب ہی اس دو کوڑی کی معشوقہ کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے گی۔

سورج ڈوبنے سے پہلے وہ واپس آ گیا۔ اولمپیاس نے بیٹے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ رات کا کھانا کھا کر حسبِ معمول اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ تب اولمپیاس نے اپنے ملازم کو بلا کر حکم دیا۔ ''اس نامراد سنبوری کو ابھی اسی وقت اٹھا کر میرے قدموں میں لے آ...''

اس نے کہا۔ ''اس کا بوڑھا باپ رکاوٹ بن سکتا ہے۔''

''قوت قدموں میں ہو تو کوئی رکاوٹ ... رکاوٹ نہیں رہتی۔ اپنے ساتھ چار سپاہیوں کو لے جا... مجھے بس وہ لڑکی چاہئے۔''

وہ حکم کا غلام چار سپاہیوں کے ساتھ سنبوری کے گھر پہنچ گیا۔ رات گئے دروازے پر دستک سنائی دی تو وہ باپ بیٹی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ سنبوری نے ایک شمعدان روشن کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے باپ کو دیکھا۔ اس نے بیرونی دروازے کو آ کر کھولا

تو باہر شاہی پیادوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ ہاتھوں میں مشعلیں لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم لوگ اس وقت میرے دروازے پر....؟ خیر تو ہے؟''

ملازم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''خیر نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کو بلا....''

اس نے ایکدم سے چونک کر پوچھا۔ ''بیٹی کو...؟ مگر کیوں...؟''

''اسے اولمپیاس نے بلایا ہے۔''

سنبوری دروازے سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اولمپیاس کا نام سن کر گھبرا گئی۔ اس کے زہریلے مزاج سے سب ہی واقف تھے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ سوچنے لگی۔ ''اولمپیاس نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

ایسے ہی وقت اس ملازم کی آواز سنائی دی۔ وہ بوڑھے باپ سے کہہ رہا تھا۔ ''زیادہ سوال جواب نہ کر۔ اپنی بیٹی کو باہر بلا۔ ورنہ ہم اندر جا کر اسے باہر لے آئیں گے۔''

وہ گھبرا کر بولا۔ ''لیکن پتہ تو چلے... بات کیا ہے؟ میری بیٹی کو کیوں بلایا جا رہا ہے؟ کیا اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟''

''ہم کچھ نہیں جانتے۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ سنبوری کو اولمپیاس کے سامنے پیش کرنا ہے۔ تُو اسے ہمارے حوالے کر دے۔''

وہ بولا۔ ''یہ تو سراسر ظلم ہے۔ میں اپنی جوان بیٹی کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔''

وہ اپنی خیر منانے کے لئے دوسرے کمرے میں چھپ گئی تھی۔ ایسے وقت باپ کی درد بھری کراہ سنائی دی۔ وہ ایکدم سے تڑپ گئی۔ دوسری بار بوڑھی چیخیں سنائی دیں۔ وہ باپ کو آواز دیتی ہوئی بیرونی دروازے پر آگئی۔ وہ بوڑھا زمین پر پڑا تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں میرے بابا پر ظلم کر رہے ہو؟''



وہ باپ کو سنبھالنا چاہتی تھی مگر دو سپاہیوں نے اسے دونوں طرف سے جکڑ لیا۔ ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ چیختی چلاتی رہ گئی۔ آس پاس کے گھروں سے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ لیکن مسلح سپاہیوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر ان شاہی پیادوں سے کوئی سوال جواب کرتے۔ سب ہی تماشائی بنے سنبوری کو بے بسی سے چیختے چلاتے ان کی گرفت میں دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے اٹھا کر رتھ پر ڈال کر گھوڑوں کو ہانکتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

سکندر نئی نویلی محبت کے نشے میں سرشار تھا۔ اپنی خوابگاہ میں آکر سنبوری کو تصور میں دیکھتے دیکھتے خوابوں میں گم ہو گیا تھا۔ یہ نہیں جان سکتا تھا کہ جس کے خوابوں اور خیالوں میں مست ہے' اسے اسی محل میں اولمپیاس کے آگے پہنچا دیا گیا ہے۔

وہ اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی اور سنبوری تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے خنجر کی طرح چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تُو اس سے جنگل ویرانے میں ملتی ہے؟ سچ بول... نہیں تو ماری جائے گی۔''

اس نے ڈرتے ڈرتے سر کو ہاں کے انداز میں ہلایا۔ اولمپیاس نے بڑی حقارت سے پوچھا۔ ''کیا تیرے دو کوڑی کے بدن کو اس نے ہاتھ لگایا ہے؟''

سنبوری نے ایک ذرا ہچکچا کر اسے دیکھا۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ غرّانے کے انداز میں بولی۔ ''کہاں کہاں لگایا ہے؟''

وہ مارے شرم کے سمٹی جا رہی تھی۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''شہزادے نے ان ہاتھوں کو پکڑا تھا۔''

اس نے پتھر جیسے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''اس کے بعد....؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''یہی حد رہی۔''

وہ دھاڑنے کے انداز میں بولی۔ ''تُو جھوٹ بولتی ہے۔''

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''عظیم دیوتاؤں کی قسم.... شہزادہ بہت شرمیلا ہے۔''

اولمپیاس نے اپنی داسیوں سے کہا۔ ''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اسے سر سے

پاؤں تک دیکھو...اس کم ذات نے ہماری شاہانہ برتری کو کہاں کہاں سے چرایا ہے؟"

داسیاں اس پر پل پڑیں۔ اس کا ایک ایک لباس اتارنے لگیں۔ وہ منتیں کر رہی تھی۔ تمام داسیوں نے مل کر اسے فرش پر پٹخ دیا۔ ان میں سے کوئی اس پر رحم کرنے والی نہیں تھی۔ اولمپیاس کا حکم حرفِ آخر ہوتا تھا۔ لباس کھلا تو کوئی شرمناک بھید نہ کھلا۔ مگر ہاں...چاندی کی وہ انگوٹھی برآمد ہوئی' جو سکندر نے نشانی کے طور پر اسے دی تھی۔

اولمپیاس ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس انگوٹھی کو داسی کے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے بولی۔ "عورت تھوڑا تھوڑا کر کے پورے مرد کو نگل لیتی ہے۔ آج چاندی کی انگوٹھی لی ہے' کل میرے بیٹے کو نگلنے والی تھی۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ سنبوری کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ غصے سے چنگھاڑ رہی تھی۔ "تجھے کیا کروں....؟ کیا کروں تجھے....؟"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی اس سے دور گئی۔ پھر پلٹ کر بولی۔ "کیا تیری گردن اُڑا دوں؟ تجھے نیزے پر اچھال دوں؟ دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دوں؟ یا اپنے سانپوں کے آگے ڈال دوں....؟"

وہ اس کی طرف آتے ہوئے بولی۔ "مگر کیا ہوگا؟ ایک ذرا تکلیف ہوگی پھر تجھے سارے دکھوں سے نجات مل جائے گی۔"

اس نے تڑاتڑ اس کے منہ پر طمانچے مارے۔ بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکے دیتے ہوئے نیچے گرادیا۔ پھر اسے ٹھوکریں مارتے ہوئے بولی۔ "میں تجھے آرام سے مرنے نہیں دوں گی۔ ایسی سزا دوں گی کہ تُو پل پل جیتی رہے گی' پل پل مرتی رہے گی۔ تُو میرے بیٹے کی راتوں میں رہنا چاہتی تھی۔ میں تجھے ہر رات نئے گاہکوں کے جہنم میں پہنچادوں گی۔"

اس نے اپنے خاص سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا۔ "اسے بازارِ حُسن میں پہنچا دو۔ وہاں دن رات پہرہ دیتے رہو اور اس کے لئے ہر رات ایک نیا گاہک پہنچاتے



رہو۔"

سپاہیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اسے دونوں طرف سے جکڑ کر وہاں سے لے جانے لگے۔ سکندر اس محل کے دور افتادہ حصے میں گہری نیند سو رہا تھا مگر جو جاگ رہے تھے' انہیں خبر مل رہی تھی کہ اولمپیاس ایک کسان کی بیٹی سے کیسا سلوک کر رہی ہے؟ وہاں کی ٹوہ لینے والوں میں آرسی نوئی اور بطلیموس پیش پیش تھے۔ ان کی جاسوس کنیز پل پل کی خبر پہنچا رہی تھی۔

بطلیموس یہ سن کر بے چین ہو رہا تھا کہ جس سنبوری پر اس کا دل آ گیا ہے' اسے بازارِ حسن میں پہنچایا جا رہا ہے۔ وہ تڑپ کر ماں سے بولا۔ "میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ وہ سکندر کو نہ ملے...مجھے تو مل سکتی ہے۔"

آرسی نوئی نے کہا۔ "اب سنبوری کی طلب کرے گا تو اولمپیاس سے کھلی دشمنی ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتی' وہ زہریلی تجھے ڈس لے۔"

"میں اس زہریلی سے بھی زہریلا ہوں۔ وہ کام کروں گا کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

ماں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تُو کرنا کیا چاہتا ہے؟"

وہ بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "اپنے سوتیلے بھائی سکندر پر ایک احسان کرنا چاہتا ہوں۔ میں سنبوری کو بازارِ حسن میں پہنچنے نہیں دوں گا۔ اس سے پہلے ہی اسے اغوا کر کے اپنی زمینوں پر لے جاؤں گا۔"

آرسی نوئی نے غصے سے پوچھا۔ "تُو ایک سوتیلے پر احسان کرنے کے لئے اولمپیاس سے دشمنی مول لینا چاہتا ہے؟"

"اولمپیاس کو خبر نہیں ہوگی اور یہ کام ہو جائے گا۔ وہ میرے قبضے میں آ جائے گی۔"

وہ الجھ کر بولی۔ "تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ تُو اسے حاصل کر کے اس سوتیلے کے حوالے کیوں کرنا چاہتا ہے؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ سیدھے ہاتھ سے حوالے کر دوں گا؟ پہلے میں اس پر مروں گا' اپنے ارمان پورے کروں گا پھر اس کی معشوقہ کو اس کے حوالے کر دوں گا۔"

"اگر اسے معلوم ہو گا کہ تُو اسے جھوٹا کھانا پیش کر رہا ہے تو....؟"

بطلیموس نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔ پھر کہا۔ "تیرا بیٹا کوئی کچا کھیل نہیں کھیلتا۔ اس حسینہ کو اچھی طرح اپنے اعتماد میں لے کر سکندر کے حوالے کروں گا۔"

سوتیلوں کے کھیل میں ایک بیچاری غریب لڑکی کا کوئی بھلا نہ ہو سکا۔ بطلیموس کے خاص سپاہیوں نے منہ پر نقاب چڑھا کر سنبوری کو بازار میں بکنے سے پہلے ہی اغوا کر لیا۔ سکندر کو کچھ خبر نہیں تھی کہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے؟ اس کی محبوبہ ہاتھ سے بے ہاتھ ہوتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے؟

سنبوری پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ پہلے وہ شاہی پیادے اسے زبردستی اٹھا کر محل میں لے آئے تھے' پھر اولمپیاس کے حکم کے مطابق اسے بازارِ حسن کے جہنم میں جھونکنے جا رہے تھے' ایسے وقت ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑی۔ دس بارہ نقاب پوش اسے مالِ غنیمت کی طرح ان سپاہیوں سے چھین کر شہر سے دور ایک ویران علاقے میں لے آئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس راستے سے گزرتی ہوئی' کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے؟

وہ نقاب پوش اسے ایک بڑے سے کچے مکان میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس مکان کے کمرے میں کئی شمعیں روشن تھیں۔ اس کچی چاردیواری کی شاہانہ طرز آرائش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کسی شاہی پناہ گاہ میں قید کر دیا گیا ہے۔ وہ نقاب پوش دروازے کو باہر سے بند کر کے چلے گئے تھے۔ وہ دروازے کو جھنجھوڑتے ہوئے گڑگڑانے لگی۔ گہرا سناٹا کہہ رہا تھا' وہاں کوئی اس کی فریاد سننے والا نہیں ہے۔ وہ دروازے سے لگی' روتی رہی' گڑگڑاتی رہی۔ "تمہیں عظیم دیوتاؤں کا واسطہ.... مجھ پر ترس کھاؤ۔ مجھے میرے بابا کے پاس پہنچا دو.... سنو..! کوئی ہے...؟"



وہ چیخ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اسے اپنے عقب سے مردانہ آواز سنائی دی۔ "وہاں کیا ڈھونڈ رہی ہے؟ میں یہاں ہوں...."

اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ بطلیموس مسکراتا ہوا پچھلے دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ سنبوری نے شدید حیرت سے پوچھا۔ "تت... تُو یہاں...؟"

وہ ایک ایک قدم چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔ "سکندر کہاں ہے؟"

"وہ کچھوے کی چال چلنے والا اپنی خوابگاہ میں سکھ کی نیند سو رہا ہے۔ اس بات سے بے خبر ہے کہ تجھ پر کیا بیت رہی ہے؟"

"اگر وہ بے خبر ہے تو تُو نے اسے بتایا کیوں نہیں؟ یہاں تجھے نہیں' اسے آنا چاہئے تھا۔"

"کیا یہ احسان کم ہے کہ میں نے اس کی محبوبہ کو بازارِ حسن میں جانے سے پہلے بچا لیا ہے؟"

وہ عاجزی سے بولی۔ "ایک احسان اور کر دے' سکندر سے میری ملاقات کرا دے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ "یہ احسان بھی کر دوں گا مگر پہلے یہ تو بتا' میرے احسانوں کا بدلہ کیسے چکائے گی؟ کیونکہ کچھ لینے کے لئے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔"

وہ بے بسی سے بولی۔ "مجھ جیسی غریب اور گھر سے بے گھر ہونے والی لڑکی بھلا تجھے کیا دے گی؟"

وہ اسے سر سے پاؤں تک گہری نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "خود کو غریب نہ سمجھ... تُو تو چلتا پھرتا خزانہ ہے...."

یہ کہتے ہوئے اس نے اس کی کلائی تھام لی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے بولی۔ "خبردار...! مجھے ہاتھ نہ لگا۔ میں سکندر کی امانت ہوں۔"

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مگر اس وقت تُو میری جاگیر پر کھڑی ہے اور یہاں آنے والی ہر چیز میری ہوتی ہے۔''

وہ مزید پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''کیا بھائی کے حق پر ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے؟''

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''بس اپنا حصہ وصول کر کے تجھے اس کے حوالے کر دوں گا۔''

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''میرے قریب مت آنا....''

''اگر سکندر کے پاس جانا چاہتی ہے تو تجھے میرے قریب آنا ہی پڑے گا۔''

وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی اور وہ آگے بڑھتا ہوا اس سے لگ گیا۔ سنبوری نے اپنے جیسی لڑکیوں کو مردوں کے آگے مجبور اور بے بس ہوتے دیکھا تھا۔ ماں نے بھی سمجھایا تھا' ملنے جلنے والی عورتیں بھی کہتی تھیں' ہم عورتیں کچھ نہیں ہوتیں۔ بس لوٹ کا مال ہوتی ہیں۔ جو لٹیرا آئے' اپنا مال راضی خوشی اس کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔

بطلیموس نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''میں تجھ سے زبردستی نہیں کروں گا۔ کروں گا تو بعد میں تُو سکندر سے میری شکایت کرے گی۔ بھائیوں میں فساد پیدا کرے گی۔ اس لئے سمجھوتہ کر لے۔ زندگی چاہتی ہے یا موت....؟''

وہ موت چاہتی تھی مگر سکندر اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ مرنے سے پہلے ایک بار اس کی آغوش میں جانا چاہتی تھی۔ یہ ایسی آرزو تھی' جو فی الوقت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ دل تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا' اپنے بدترین حالات سے گزرنے کے بعد ایک بار اپنے مہربان کا چہرہ دیکھ لے۔

بطلیموس کہہ رہا تھا۔ ''تجھے اس شرط پر زندگی ملے گی کہ تُو جوانی کی سوغات پہلے مجھے دے گی اور اس کا ذکر سکندر سے نہیں کرے گی۔ میں تجھے کلی سے پھول بناؤں گا۔ مگر تُو اس کے پاس ایسی ہی معصوم سی کلی بن کر جائے گی۔ وہ عورتوں کے معاملے میں اناڑی ہے' ہماری چوری نہیں پکڑ پائے گا۔''



وہ اس کی باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ اس کے اندر ایک ہی آرزو چیخ رہی تھی' اسے پکار رہی تھی۔ ''سکندر....! سکندر....! میرے شہزادے! میں کیا کروں؟ حالات مجھے کس موڑ پر لے آئے ہیں؟ میں تیری امانت کی قربانی دے کر ہی تجھ سے مل سکتی ہوں۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ ''مجھ سے دوستی کرے گی' سمجھوتہ کرے گی تو محل میں پہنچ کر بھی میری رازدار بن کر رہے گی۔ انکار کرے گی تو تجھے جبراً حاصل کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جب میرا دل بھر جائے گا تو تجھے سکندر کے پاس واپس جانے کے لئے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اپنے فائدے پر نظر رکھ.... تجھے صرف سکندر سے ہی نہیں' مجھ سے بھی منہ مانگی دولت ملتی رہے گی۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ وہ قریب آیا تو خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ گزشتہ رات کی سیاہی نے ایسی کالک مل دی تھی کہ وہ کسی کو منہ دکھانا نہیں چاہتی تھی مگر دل تھا کہ ایسی بدحالی کے بعد بھی اپنے محبوب سے ملنے کے لئے بے چین ہوا جا رہا تھا۔

بطلیموس زبان کا دھنی تھا۔ دوسری صبح اس نے کہا۔ ''میں تجھے سکندر سے ملوا دوں گا۔ لیکن خبردار....! اپنی زبان پر قائم رہنا۔ میرے خلاف کچھ بولے گی تو سکندر سے میں کسی طرح نمٹ ہی لوں گا مگر تجھے بازارِ حسن میں پہنچا دوں گا۔''

سنبوری نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سکندر ہوا خوری کے بہانے جنگل کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت بطلیموس نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''وہ وہاں نہیں ہے' جہاں تُو جا رہا ہے۔''

اس نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ بطلیموس اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بولا۔ ''سنبوری سے ملنا چاہتا ہے تو میرے ساتھ چل....''

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''تیرے ساتھ مگر کہاں....؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گھوڑے کو ہانکتا ہوا محل کی حدود سے باہر جانے لگا۔

سکندر بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا تھا۔ وہ راستے بھر اس سے سوالات کرتا رہا۔ یہ جاننے کی بے چینی ہوگئی تھی کہ وہ سنبوری کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ اگر وہ جنگل میں نہیں ملے گی تو کہاں ملے گی؟ بطلیموس کیسے جانتا ہے کہ جہاں لے جا رہا ہے' وہاں ملے گی؟ وہ اپنے سوالوں کے جواب چاہتا تھا لیکن اس کی خاموشی نے بری طرح الجھا دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس بڑے سے کچے مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ سکندر نے الجھ کر پوچھا۔ ''تُو مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟ میری کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہا ہے؟ آخر سنبوری کہاں ہے؟''

وہ گھوڑوں سے اتر مکان کے اندر آ گئے۔ بطلیموس اسے ایک نشست پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''لمبی کہانی ہے۔ سنے گا تو ہوش اڑ جائیں گے۔''

پھر وہ اسے تمام صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تُو اپنی ماں کے زہریلے مزاج سے واقف ہے۔ کیا تجھے یقین ہے' ایک ماں نے اپنے بیٹے کی محبوبہ کو بازارِ حسن میں پہنچا دیا ہوگا؟''

''میں اپنی ماں کے مزاج کو خوب سمجھتا ہوں، مگر یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ اس حد کو پہنچ جائے گی۔ مجھے تیری بات کا یقین نہیں ہو رہا ہے۔ تُو میرے پیار کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے یہاں تک دوڑاتا لایا ہے۔''

''تُو گھڑ دوڑ میں ہمیشہ اول آتا ہے۔ آج بھی تجھے اول آنے کا انعام ملے گا۔ میں ابھی تجھے سنبوری کے پاس پہنچاؤں گا تو میری سچائی کو تسلیم کرلے گا۔''

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''سنبوری کہاں ہے؟''

''سنبوری یہاں ہے۔ اسی چار دیواری میں ہے۔ تُو نے کئی برس پہلے سانپ کے زہر سے مجھے بچایا تھا، آج میں سنبوری کو تیری ماں کے زہر سے بچا کر لایا ہوں۔ تیرے احسان کا بدلہ چُکا رہا ہوں۔ جا.... وہ ادھر اس کمرے میں ہے۔''

سکندر نے اسے احسان مندی سے دیکھا۔ ان لمحات میں سگے اور سوتیلے کا فرق



مٹ گیا تھا۔ اس نے متاثر ہو کر سوچا۔ ''بطلیموس سوتیلا سہی... مگر اس نے بھائی ہونے کا حق ادا کیا ہے۔''

وہ بڑی بے قراری سے دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ بطلیموس نے کہا۔ ''اولمپیاس کے وفادار سپاہی کتوں کی طرح سنبوری کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔''

وہ چلا گیا۔ سکندر تیزی سے چلتا ہوا دروازے کو کھولتا ہوا اس کمرے میں پہنچا۔ سنبوری سر جھکائے ہاتھ باندھے ایک گوشے میں کھڑی ہوئی تھی۔ جس محبوب کے انتظار میں تھی' اسے دیکھتے ہی نگاہیں شرم سے جھک گئی تھیں۔ اس نے قریب آ کر دونوں بازو پھیلائے تو وہ خود کو نہ روک سکی۔ تڑپ کر' آگے بڑھ کر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ ایسے وقت اس کے ہاتھ سے ایک شیشی گر پڑی۔ سکندر اپنی جانِ حیات کو پالینے کی خوشی میں نہ دیکھ سکا۔ وہ زہر کی شیشی تھی۔

جب پہلی بار اولمپیاس کے سپاہی اس کے بابا کے پاس آئے تھے' تب ہی وہ زہر اس نے چھپا کر رکھ لیا تھا۔ اب وہ زہر اس کی شرم کو ڈھانپنے کے کام آ رہا تھا۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔ ''بس ایک بار.... بس ایک آخری بار تیرے سینے سے لگنے کی آرزو تھی اور اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے میں ایک پل صراط سے گزر کر آئی ہوں۔ مجھے معاف کرنا میرے محبوب! میں تیری امانت سنبھال کر نہ رکھ سکی۔ تیرے سوتیلے بھائی نے مجھے لُوٹ لیا ہے۔''

سکندر کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ماں زہریلی تھی۔ سانپوں کو پٹاروں میں پالتی تھی۔ اب پتہ چلا' وہ سوتیلا اس سے بھی زیادہ زہریلا ہے۔ آستین میں پلتا رہا ہے۔ وہ بول رہی تھی۔ ''میں تجھے جھوٹا نہیں کھانے دوں گی۔ تیرے پہلے' سچے اور کنوارے پیار کی توہین نہیں کروں گی۔ اس لئے دنیا سے جا رہی ہوں۔''

سکندر نے چونک کر اسے اپنے سینے سے الگ کیا۔ سنبوری کے نیلے پڑتے ہوئے بدن نے اور باچھوں سے بہتے ہوئے لہو نے سمجھا دیا کہ سوتیلا سچ مچ اسے ڈس

کر گیا ہے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑی رہنے کے قابل نہیں رہی تھی، گرنے والی تھی۔ وہ اسے لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے لگاتے ہوئے بولا۔ "یہ تُو نے کیا کیا؟ میں تجھے کہاں لے جاؤں؟ کیسے بچاؤں؟ دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ کوئی سانپ کا منتر جاننے والا نہیں ہے۔"

وہ بڑی حسرت سے محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لمس کو جیسے اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اس نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ "بس میری آخری آرزو پوری ہو گئی۔ الوداع میرے شہزادے...!"

یہ کہتے ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ سکندر گہرے صدمے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ "سنبوری پر یہ ظلم کیوں ہوا؟ یہ اپنی طبعی عمر تک کیوں جی نہ سکی.....؟ میری وجہ سے... میرے پیار کی وجہ سے... میری سگی ماں اور سوتیلے بھائی کی وجہ سے...."

وہ صدمے سے ٹوٹ رہا تھا۔ بطلیموس کا خیال آتے ہی اس کے وجود میں انگارے سے دہکنے لگے۔ وہ اس مکان میں نہیں تھا۔ اسے سنبوری کے پاس چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ سکندر نے باہر آ کر آس پاس دور تک دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے بطلیموس کے ایک وفادار کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "تیرا آقا کہاں ہے؟"

سکندر کے تیور دیکھ کر وہ سہم گیا تھا۔ گھبرا کر بولا۔ "وہ... وہ یہاں نہیں ہے۔ محل کی طرف گیا ہے۔"

وہ اسے ایک طرف دھکا دیتا ہوا پھر اپنی سنبوری کے پاس آیا۔ باہر کھڑے ہوئے پہرے داروں کو بلا کر کہا۔ "یہ بے گھر، بے در ہو چکی ہے۔ زندگی میں اسے کہیں تحفظ اور پناہ نہیں ملی۔ قبر کی گود میں ہی اسے آرام ملے گا۔ فوراً ایک قبر تیار کرو۔"

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ ایک کمرے میں سنبوری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ سکندر اس کے پاس آ کر لیٹ گیا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا۔ "محبت کرنے والے ساری



زندگی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ خواہ کتنی ہی گہری محبت ہو، کوئی کسی کے ساتھ قبر میں نہیں سوتا۔ بس یہی چند گھڑیاں ہیں، جو تیرے ساتھ گزار رہا ہوں۔ تجھ سے وعدہ کرتا ہوں، تیرے گناہ گار کو نہیں چھوڑوں گا۔"

قبر تیار ہو گئی۔ سکندر نے بڑی محبت سے، بڑے جذبے سے اسے قبر کی آغوش میں سلا دیا۔ پھر بیوسی فالس پر سوار ہو کر آندھی طوفان کی طرح محل کی طرف جانے لگا۔ اس دوران بطلیموس کا ایک ملازم گھوڑے پر سوار ہو کر ایک سمت جانے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا آقا اس وقت کہاں ملے گا؟ بطلیموس بے خبر تھا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ حالات کی ماری ہوئی لڑکی اپنی جان پر کھیل کر اس کی موت کا سبب بن چکی ہے۔

سکندر کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ محل میں پہنچ کر سیدھا بطلیموس کی خوابگاہ میں آیا تو بیدیاس اسے دیکھ کر چونک گئی۔ شہزادے نے گرج کر پوچھا۔ "بطلیموس کہاں ہے؟"

وہ سہم کر بولی۔ "مجھے نہیں معلوم..."

وہ اس خوابگاہ کو گھوم گھوم کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ کہاں چھپے گا؟ کب تک چھپے گا؟ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا؟"

بیدیاس نے کہا۔ "میرا یقین کر... وہ یہاں نہیں ہے۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ تیری آغوش میں نہیں ہے تو ضرور ماں کی گود میں جا کر چھپ گیا ہو گا۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا آرسی نوئی کی خوابگاہ میں آیا۔ وہ اس کی اچانک آمد پر ایکدم سے چونک گئی۔ دوسری طرف اولمپیاس کو اس خبر نے چونکا دیا تھا کہ سکندر غصے کے عالم میں بطلیموس کے کمرے کی طرف گیا ہے۔ آرسی نوئی کے رہائشی حصے میں اسے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

وہ بات کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے بے چین ہو گئی۔ ایسی گھمنڈی تھی کہ کبھی

آرسی نوئی یا دوسری بیگمات کے پاس خود چل کر نہیں جاتی تھی۔ بلکہ ان کے رہائشی حصے میں قدم رکھنے کو اپنی توہین سمجھتی تھی مگر اس وقت وہ اپنی اَنا اور اپنے غرور کو بالائے طاق رکھ کر آرسی نوئی کی خوابگاہ کی طرف جانے لگی۔

ادھر آرسی نے سکندر کو گھورتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ''کیا محل کے ادب و آداب بھول گیا ہے؟ کسی کی بھی خوابگاہ میں آنے سے پہلے اجازت لی جاتی ہے۔''

وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ''بطلیموس کہاں ہے؟''

''بطلیموس...؟ وہ تو تیرے ساتھ ہی گیا تھا۔''

وہ خوابگاہ کے مختلف حصوں میں اسے تلاش کرنے لگا۔ آرسی نوئی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے؟ پہلے بنا اجازت اندر گھس آیا اور اب مجھ سے پوچھے بغیر میری خوابگاہ میں دندناتا پھر رہا ہے؟ میں کہتی ہوں' یہاں سے چلا جا ورنہ....''

وہ غرا کر بولا۔ ''اس چوہے کو بل سے نکال دے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

وہ ڈپٹ کر بولی۔ ''تمیز سے بات کر... وہ تیرا بڑا بھائی ہے۔''

''اس بڑے نے بہت بڑا کام دکھایا ہے۔ میں اسے نیزے کی بلندی پر اٹھانے والا ہوں۔''

ایسے ہی وقت اولمپیاس بھی وہاں پہنچ گئی۔ بیٹے کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے؟ تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

آرسی نوئی نے کہا۔ ''دیکھ لے... تیرا بیٹا یہاں بدمعاشی کرنے آیا ہے۔ میرے بیٹے کے خلاف بول رہا ہے۔''

سکندر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''صرف بولوں گا نہیں... کر کے دکھاؤں گا۔ یہ سمجھ لے' تیرا بیٹا اب گیا.... جب تک چھپا ہوا ہے' تب تک سانسیں لے رہا ہے۔ سامنے آئے گا تو ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لینے دوں گا۔''

آرسی نوئی نے ایکدم سے چونک کر اسے دیکھا۔ اولمپیاس نے کہا۔ ''آخر بات



کیا ہے؟ کچھ بتا تو سہی.... بطلیموس نے ایسا کیا کیا ہے کہ....''

وہ اس کی بات کاٹ کر تنبیہ کرنے کے انداز میں ماں کو انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بھی سوال کرنے سے پہلے میرے ایک سوال کا جواب دے...''

وہ اس کا لہجہ سن کر ٹھٹک گئی۔ ذرا حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''سنبوری کہاں ہے؟''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''سنبوری...؟ کون سنبوری....؟''

''وہی... جسے تُو بازارِ حسن میں پہنچانے والی تھی۔''

اس کی اس بات نے سمجھا دیا کہ بیٹے کو سنبوری کے متعلق ماں کی انتقامی کارروائی کا علم ہو چکا ہے۔ اس نے ایک نظر آرسی نوئی پر ڈالی۔ پھر بیٹے سے کہا۔ ''اس مسئلے پر اپنی چاردیواری میں بات کی جائے تو بہتر ہوگا۔''

وہ پلٹ کر جانا چاہتی تھی۔ سکندر نے چلا کر کہا۔ ''میں یہاں سے تب تک نہیں جاؤں گا' جب تک بطلیموس کو میرے حوالے نہیں کیا جائے گا۔''

آرسی نوئی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تُو میرے بیٹے کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ اپنی محبوبہ کے بارے میں چھان بین کرنا چاہتا ہے تو اپنی ماں کے ساتھ جا... بطلیموس کو کیوں ڈھونڈ رہا ہے؟''

وہ اس کی طرف پلٹتے ہوئے غرایا۔ ''میں صرف اپنی ماں کو زہریلی سمجھتا تھا مگر آج اندازہ ہوا' تُو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ تیرے سنپولے نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ میری سنبوری کی عزت لوٹی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اولمپیاس بیٹے کی بات سن کر رک گئی تھی۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ سنبوری کے معاملے سے بطلیموس کا کیا تعلق ہے؟ سکندر نے آرسی نوئی سے کہا۔ ''میری ماں اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ نہ یہ اس غریب لڑکی پر ظلم کرتی اور نہ وہ تیرے سنپولے کے ہتھے چڑھتی۔ سگی ماں نے ابتدا کی اور سوتیلے بھائی نے انتہا کر دی۔''

اولمپیاس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سنبوری کے سلسلے میں پریشان ہوتی

رہی تھی۔ یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کون اغوا کر کے لے گیا ہے؟ اس کے وفادار شہر بھر میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور اب پتہ چل رہا تھا کہ اس سوتیلے نے مکاری دکھائی ہے۔ وہ تیور بدل کر بولی۔ ''کیا سنبوری بطلیموس کے پاس ہے؟''

وہ بولا۔ ''تم سگے سوتیلوں نے مل کر اس معصوم کی جان لے لی ہے۔ مجھے تم سب سے انتقام لینا چاہئے۔ میں اپنی ماں کا محاسبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے ناراض ہو سکتا ہوں۔ بیٹے کی زبان سے بات تو کروں گا مگر اسے ماں نہیں کہوں گا۔''

پھر اس نے آرسی نوئی سے کہا۔ ''تجھ سے براہِ راست انتقام نہیں لوں گا۔ تیرے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتاروں گا تو تُو آدھی مر جائے گی۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے جا رہا تھا اور بول رہا تھا۔ ''وہ دشمن سوتیلا مجھ سے چھپ نہیں سکے گا۔ میں آج ہی اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔''

وہ جاتے وقت پاؤں پٹخ رہا تھا اور ان دونوں سوکنوں کے دلوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ دونوں کی ممتا کو روندتا جا رہا تھا۔ ایک کی ممتا کو رَد کر چکا تھا اور دوسری کے ممتا کو خوفزدہ کر رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے محروم ہونے والی ہے۔

دونوں ہی سوکنوں نے یہ بات فیلقوس تک پہنچائی۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''میں ان سوتیلوں کو ہمیشہ جوڑ کر رکھتا آیا ہوں۔ آج ایک بیٹا دوسرے کا جانی دشمن کیسے ہو گیا؟''

آرسی نوئی نے اولمپیاس کو چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تیری چہیتی ہے۔ اسی نے عداوت کی آگ بھڑکائی ہے۔''

وہ فیلقوس کو سنبوری اور سکندر کا عشقیہ واقعہ بتانے لگی۔ فیلقوس سن رہا تھا اور اولمپیاس کو غصے سے دیکھ کر تلملا رہا تھا۔ ''تو سچ مچ زہریلی ہے۔ آج میرے دونوں بیٹوں کو تُو نے عداوت کا زہر پلا دیا ہے۔ ایک باپ دو سوتیلے بیٹوں کو جوڑ کر کس طرح اپنی حکومت اور اپنی طاقت کو قائم رکھتا ہے' یہ تجھ جیسی ناقص العقل عورتیں سمجھ نہیں سکتیں۔ تُو نے میرا آج ہی نہیں' کل بھی خاک میں ملا دیا ہے۔ میں تیری صورت نہیں



دیکھنا چاہتا۔ میری نظروں سے دور ہو جا... جب تک میرے بیٹوں میں صلح صفائی نہیں ہو گی' تب تک میں تیری خوابگاہ کی طرف نہیں آؤں گا۔ جا... دفع ہو جا....''

اولمپیاس اپنی غلطی ماننے والی عورتوں میں سے نہیں تھی۔ سر جھکانا نہیں جانتی تھی۔ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ آرسی نوئی اندر سے کھل گئی تھی۔ پہلی بار اس کے سامنے ایک سر چڑھی مغرور سوکن کی توہین ہوئی تھی۔ اس کے مقابلے میں آج برتری حاصل ہوئی تھی۔ لیکن اتنی بڑی خوشی پر یہ خوف حاوی تھا کہ سکندر اس کے بیٹے کی جان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔

اس نے اپنا خوف ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پہلی بار سکندر کو ایک درندے کے روپ میں دیکھا ہے۔ وہ میرے بیٹے کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ اگر تُو نے اُس درندے کے خلاف فوری کارروائی نہ کی تو میرے ہی نہیں' تیرے بیٹے کا بھی خون بہے گا۔ وہ ہم دونوں کا ہے۔''

فیلقوس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں تجھ سے زیادہ فکر مند ہوں۔ یہاں سے چلی جا... مجھے سوچنے دے۔ تیرے بیٹے بطلیموس نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کھل کر سوتیلے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ جا.... تُو بھی یہاں سے دفع ہو جا۔''

وہ سر جھکا کر چلی گئی۔ فیلقوس نے اپنے مصاحب خاص سے کہا۔ ''تُو ابھی جا۔ بطلیموس جہاں بھی ہو' اسے کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دے۔ جب دو سوتیلوں میں ٹھن جاتی ہے تو تاج گر جاتے ہیں' تخت کا تختہ ہو جاتا ہے اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ مصاحب خاص وہاں سے چلا گیا۔ فیلقوس نے سکندر کے اس اتالیق کو طلب کیا' جو اسے سپاہ گری کی تربیت دیا کرتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سکندر تیرا لحاظ کرتا ہے۔ تُو ابھی جا... اسے حکومتی اُمور کے متعلق سمجھا کہ دو بھائیوں کی عداوت سے ان کا باپ کمزور پڑ جائے گا۔ دو سپاہی جان لیوا جنگ کے دوران بھی مصلحتاً سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

اسے بھی سمجھوتے کی راہ نکالنی چاہئے۔تُو اسے سمجھاتے ہوئے میرے پاس لے آ...''

وہ اتالیق بھی وہاں سے چلا گیا۔وہ تنہا اپنی مسند پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔سوچنے کے دوران اپنی ایک آنکھ سے خلا میں تک رہا تھا۔اس کی ایک ہی آنکھ تھی۔دو ہوتیں' تب بھی دونوں بیٹوں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا۔

اُصولاً اور قانوناً سکندر کا پلڑا بھاری تھا۔اس کے ساتھ سراسر زیادتی ہوئی تھی۔وہ ایک عاشق اور ایک سپاہی کی حیثیت سے انتقام لینے میں حق بجانب تھا لیکن انتقام کے نتیجے میں اپنا ہی ایک بیٹا مارا جانے والا تھا۔

وہ مسند سے اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے ٹہلنے لگا۔حادثات نے اُسے یک چشم اور یک پا بنا دیا تھا۔دوسرے پاؤں میں نقص تھا اس لئے ذرا لنگڑا کر چلتا تھا۔آج اسے یوں لگ رہا تھا' جیسے سچ مچ ایک ٹانگ ٹوٹنے والی ہے۔وہ دونوں پاؤں جما کر زمین پر کھڑا نہیں رہ پائے گا۔

سکندر اپنے اتالیق کے ساتھ وہاں آیا۔اس نے شاہی آداب کے مطابق دایاں ہاتھ بڑھا کر سر کو جھکایا۔فیلقوس نے آگے بڑھ کر بیٹے کے ہاتھ کو چوم لیا۔پھر کہا۔''جانِ پدر! مجھے تیرے تمام حالات کا علم ہو چکا ہے۔میں تیری حمایت کرتا ہوں۔میری تمام ہمدردیاں تیرے ساتھ ہیں۔''

''تُو میرے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے تو بطلیموس کو بھی طلب کر۔ہمارا اتالیق یہاں موجود ہے۔اس کے سامنے ہمارا مقابلہ ہوگا۔اسے خود پر بڑا ناز ہے کہ وہ تلوار کا دھنی ہے۔مگر تیرے خون کی قسم! اس کی تلوار ٹوٹے گی اور میں اسے زندگی سے توڑ کر رکھ دوں گا۔''

وہ بولا۔''جنگ میں ایک مارا جاتا ہے اور دوسرا میدان مارتا ہے۔دونوں صورتوں میں میرا ہی نقصان ہوگا۔میرا ہی خون بہے گا۔میری ہی کمر ٹوٹے گی۔میں تجھے سمجھاتا ہوں' سمجھوتہ کر لے۔میں تیرے سامنے اسے سخت سے سخت سزا دوں گا۔''



سکندر نے کہا۔''کسی دوسرے کے ہاتھوں سزا دلانا اور بات ہے اور اپنے ہاتھوں سے انتقام لینا اور بات ہے اور پیاس انتقام لینے سے ہی بجھتی ہے۔''

وہ ایک آنکھ سے سوچتا ہوا بیٹے کو دیکھنے لگا۔وہ اسے حکم دے سکتا تھا۔جبراً اسے انتقامی کارروائیوں سے روک سکتا تھا اور وہ بظاہر مان جاتا۔لیکن درپردہ دشمنی اور زیادہ پکتی رہتی۔وہ دونوں تربیت حاصل کرنے کے دوران یا آئندہ کسی جنگ کے دوران دشمنوں کے خلاف تو ضرور ہوتے لیکن ذاتی مخالفت کو کبھی نہ بھولتے۔دشمن پر وار کرنے والی تلوار کسی ایک بھائی کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

سیدھی سی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ دونوں بھائی آگ ہو چکے ہیں۔کوئی بھی کسی کو بھی جلا سکتا ہے۔انہیں ایک چھت کے نیچے یا کسی ایک علاقے میں ساتھ ساتھ رکھنا سراسر نادانی ہوتی۔

وہ بیٹے کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔پھر اس نے کہا۔''فی الحال میں بطلیموس کو یہاں طلب نہیں کروں گا اور نہ ہی تم دونوں کو مقابلہ کرنے کی اجازت دوں گا۔میری ایک آنکھ گئی' میری ایک ٹانگ گئی۔میں نہیں چاہتا کہ میرا ایک بازو بھی چلا جائے۔''

سکندر نے پوچھا۔''کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوگا؟''

''میں منصف ہوں۔تجھ سے انصاف کروں گا۔میں ایک باپ ہوں۔دوسرے بیٹے کو تحفظ بھی دوں گا۔تجھے اجازت ہے' اسے ڈھونڈ کر انتقام لے سکتا ہے۔میری حکمت عملی یہ ہوگی کہ میں تم دونوں کو کبھی آمنے سامنے نہ ہونے دوں۔جا....ایک بادشاہ کا انصاف کہتا ہے' اپنے انتقام کی پیاس بجھا لے۔''

''تُو نے انصاف کیا' تیرا شکریہ...''

وہ سر جھکا کر الٹے قدموں چلتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔فیلقوس زمانے کی دھوپ چھاؤں دیکھتا آرہا تھا۔بیٹے کے تیور کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوامخواہ بطلیموس کے پیچھے دشمنی کو زیادہ سے زیادہ ہوا دیتا رہے۔

اس نے اچانک ہی شاہی فرمان جاری کیا کہ سکندر کو ایک ضروری مہم پر روانہ

ہونا ہے۔ آخر ایک دن اسے باپ کی جگہ سنبھالنی ہی تھی اور باپ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر زرہ بکتر پہن کر کبھی نہ کبھی میدانِ جنگ میں جانا ہی تھا۔ یہ بات اس کے لئے خوش آئند تھی کہ میدانِ جنگ میں اسے جواں مردی کے جوہر دکھانے کا موقع دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات بھی کھٹک رہی تھی کہ باپ نے اسے بطلیموس سے دور کرنے کے لئے یہ شاہی فرمان جاری کیا ہے۔

فیلقوس ایک آنکھ اور ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود اس لئے کامیاب حکمران تھا کہ وہ بڑی حکمت سے کام لیتا تھا۔ بے شک وہ ان سوتیلوں کو ندی کے دو کنارے بنا رہا تھا، جو کبھی نہیں ملتے۔ دوسرا یہ کہ وہ سکندر کو اس کی ماں اولیپیاس کے دائرہ اثر سے بھی نکال رہا تھا۔ وہ باپ کے خلاف بیٹے کو قطرہ قطرہ زہریلے الفاظ سنایا کرتی تھی۔

سکندر کو جس فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا تھا۔ وہ کبھی ساحل بحر کی شاہراہ کے گرد و غبار سے گزرتی اور کبھی پہاڑوں کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے آگے بڑھتی جلد ہی تھی۔ اسے پہلی بار ایک طویل پیچیدہ فوجی سفر طے کرنے کا تجربہ ہو رہا تھا۔ فیلقوس فوج کے آگے آگے رہتا تھا اور بیٹا پیچھے....

جب وہ اپنے گھوڑے بیوسی فالس پر سوار ہو کر فوج میں آیا تھا تو یہ خیال تھا کہ اسے منتخب مصاحبوں کے رسالے کے ساتھ چلایا جائے گا۔ لیکن یہ سکندر کی خوش فہمی تھی۔ فیلقوس نے اسے باربرداری کی گھوڑیوں کے ساتھ متعین کیا تھا۔ وہ سپاہیوں، گھوڑوں اور سامان کی نگرانی کرتے کرتے پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا۔ کبھی آگے جاتا تھا، کبھی پیچھے آتا تھا۔ بڑی مشقت اٹھانی پڑ رہی تھی۔

وہ فوج بعض اوقات دن رات چلتی رہتی تھی۔ اگر رات کے وقت وہ کسی شہر میں داخل ہوتے تھے تو ایک ذرا ستانے کے بعد صبح ہوتے ہی وہاں سے کوچ کر جاتے تھے۔

ایک رات انہوں نے جس جگہ قیام کیا، وہاں سکندر نے ایک حسین دوشیزہ کو فوج



میں دیکھا۔ پتہ نہیں، وہ کہاں سے آ گئی تھی؟ بس اتنا معلوم ہوا کہ وہ اطالوس نامی ایک سپاہی کی بھتیجی ہے اور اس کا نام قلوپطرہ ہے۔ اگرچہ وہ چودہ برس کی تھی مگر بھرپور دوشیزہ تھی۔ نیم باز آنکھوں سے ایسے دیکھتی تھی، جیسے اپنی طرف پکار رہی ہو۔ بعد میں پتہ چلا، فیلقوس اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ اسی لئے پوری فوج میں وہی ایک دوشیزہ دکھائی دے رہی تھی۔

سپاہی اپنے خیموں میں دبی زبان سے فیلقوس پر تبصرہ کرتے تھے۔ اسے "یک چشم روباہ" اور "لنگڑا بکرا" کہتے تھے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ قسمت کا دھنی ہے۔ صرف زمینوں کو ہی نہیں، حسیناؤں کو بھی فتح کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ درۂ دانیال کے پاس ایک پہاڑی راستے میں آ کر ٹھہر گئے تھے۔ وہاں راتوں کو بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ شراب کا دور چلتا تھا۔ صرف سکندر جیسے چند جنگجو تھے، جو شراب سے پرہیز کرتے تھے۔

فوج کے ایک افسر ہفااسٹن نے شراب کا جام اٹھاتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔ "میرے جاں نثار ساتھیو...! میں دعوے سے کہتا ہوں، سکندر کبھی بادشاہ نہیں بنے گا اور نہ ہی کبھی سپہ سالار بنے گا۔ اسے تو فوج میں سب سے پیچھے گھوڑوں کی اور سامان کی نگرانی کے لئے رکھا گیا ہے۔"

چونکہ سکندر پہلی بار اس فوج میں شامل ہوا تھا۔ اس لئے بہت کم لوگ اسے چہرے سے پہچانتے تھے۔ ہفااسٹن نشے میں بول رہا تھا، یہ نہیں جانتا تھا کہ سکندر اس کے سامنے کھڑا سب کچھ سن رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "فیلقوس اپنے بیٹے کی زنانہ عادتوں اور کتابوں کے شوق سے بیزار ہے۔ میرے جاں نثار ساتھیو! میں درست کہہ رہا ہوں نا....؟"

جاں نثار ساتھیوں کو چپ لگ گئی تھی۔ وہ کبھی سکندر کو اور کبھی اپنے افسر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اس کی ماں اولیپیاس ایک ساحرہ ہے۔ شاید وہ کوئی جادوگری دکھا کر اپنے بیٹے کو بادشاہ بنا لے۔ ویسے بیٹا اس قابل نہیں ہے؟"

سکندر خاموش تھا مگر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ سپاہیوں کا خیال تھا کہ اب وہ اس کمانڈار ہفااسشن سے دو دو ہاتھ کرے گا۔ ایسے ہی وقت فوج کا ایک دستہ وہاں آ کر رک گیا۔ اس دستے کے سالار نے سکندر کے سامنے جھک کر کہا۔ ''اے سکندر خوش بخت! ایک بری خبر ہے۔ بادشاہ زخمی ہو گیا ہے۔ تجھے فوراً طلب کیا گیا ہے۔''

ہفااسشن کو جب معلوم ہوا کہ سکندر اس کے عین مقابل ہے تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے فوراً ہی تلوار نکال کر اپنی ہتھیلیوں پر رکھی۔ پھر اسے سکندر کے سامنے پیش کرتے ہوئے گھٹنے ٹیک کر بولا۔ ''میری گردن اڑا دے یا مجھے بخش دے مگر میری اس گستاخی کی شکایت بادشاہ سے نہ کر۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔''

سکندر جس قدر غصے میں تھا' اسی قدر اچانک نرم پڑ گیا۔ سنجیدگی سے بولا۔ ''میرا باپ فیلقوس سونے کے انبار قربان کر دیتا ہے۔ لیکن اپنے جاں نثاروں کی جان نہیں لیتا ہے۔ ان کی بڑی سے بڑی غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔''

اس نے ہفااسشن کی تلوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اس گستاخی سے مشتعل ہو کر تیری جان نہیں لوں گا۔ جا... تجھے معاف کیا۔''

فیلقوس کو ایک دشوار گزار راستے میں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کا کولہا اتر گیا تھا۔ وہ بے بسی سے ایک ڈولی پر پڑا ہوا تھا۔ شاہی حکیم اس کے علاج میں مصروف تھا۔ فیلقوس نے بیٹے کو دیکھ کر کہا۔ ''میری اس حالت نے تاخیر کی صورت پیدا کر دی ہے۔ ہم برف بری پیشتر پیلا نہیں جا سکیں گے۔ میں نے یہ افواہ سنی ہے کہ تُو پیلا میں حکمرانی کا کاروبار سنبھالنا چاہتا ہے۔ کیا واقعی تُو میری فوج کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہے؟''

سکندر نے سر جھکا کر کہا۔ ''تُو مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ مجھے حکمرانی کا نہیں' تحصیل علم کا شوق ہے۔''

''علم ضرور حاصل کر۔ لیکن اس کے ساتھ حکمرانی کا تجربہ حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں' تُو پیلا چلا جا...''



سکندر نے ٹھٹک کر باپ کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''اس چھوٹے سے علاقے میں میری نیابت کے فرائض سنبھال لے۔''

سکندر اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تُو مجھے کیا اختیارات سونپ رہا ہے؟ وہاں مجھے کون کون سے فرائض ادا کرنے ہوں گے؟''

فیلقوس نے ایک شاہی مہر اس کے حوالے کی اور کہا۔ ''میں تجھے پورے اختیارات دے رہا ہوں۔''

وہ اسے حکومتی امور کے متعلق سمجھانے لگا۔ ''شاہی خطوط پر دستخط ثبت کرتے رہنا تیرا کام ہے۔ جو واجب الادا رقمیں ہوں' انہیں مقررہ وقت پر ادا کرتے رہنا۔ لوگوں سے وعدے کرنے میں احتیاط سے کام لینا۔ میں نے سونے کے انبار صرف کئے۔ تاکہ تُو ارسطو سے تعلیم حاصل کر سکے۔ سیاسی معاملات میں اس دانشور فلسفی سے مشورے لیتے رہنا۔ یہ تیرے سامنے اینٹی پیٹر کھڑا ہے۔ اسے اپنا فوجی مشیر بنا لے۔ تیرے ساتھ ایک محافظ فوجی دستہ رہا کرے گا۔ جانِ پدر! یہ یاد رکھ' تُو ارسطو اور اینٹی پیٹر سے کبھی فریب نہیں کھائے گا۔ ان دونوں پر اندھا اعتماد کر سکے گا۔''

وہ اپنے تجربات کے مطابق بیٹے کو نصیحتیں کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے اور زیادہ محبت کا اظہار کس طرح کرے؟ اس نے بیٹے کو پاس بلا کر اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ''میں اپنے ایک چھوٹے سے علاقے کے حکمران کو مبارکباد کہتا ہوں۔ جا... اپنی ذمہ داریاں سنبھال...''

سکندر نے اس شاہی مہر کو اپنے کمربند میں محفوظ کر لیا۔ باپ سے رخصت ہو کر پیلا آ گیا۔ وہاں اینٹی پیٹر نے انتظامی امور سنبھال لئے۔ اولمپیاس خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اب تو بیٹا حکمران بن گیا تھا۔ اس لئے وہ بھی محل کی مختارِ کل بن گئی۔ اس سلسلے میں فیلقوس کا احسان ماننے کو تیار نہیں تھی۔ بیٹے کو بھڑکانے کے لئے کہتی تھی۔ ''تُو اپنے باپ کی مکاری کو نہیں سمجھتا ہے۔ وہ تجھے بطلیموس سے دور رکھنے کے

لئے فوجی اور حکومتی معاملات میں الجھا رہا ہے اور تیری ماں سے بھی ناانصافی کر رہا ہے۔''

سکندر نے پوچھا۔ ''کیسی ناانصافی؟''

''کیا تُو نے اُس ناگن قلوپطرہ کو نہیں دیکھا؟ جب فیلقوس پر ہوس غالب آتی ہے تو وہ کیچڑ میں بھی اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔ تُو دیکھ لینا... وہ ناگن تیری ماں کے حقوق کو ڈسنے والی ہے۔ میں نے ایک طویل عرصے تک اپنی زندگی میں کسی سوکن کو آنے نہیں دیا مگر اب شاید اسے روک نہیں پاؤں گی۔''

سکندر نے کہا۔ ''بادشاہ خودسر ہوتا ہے۔ کوئی اسے اپنی من مانی سے روک نہیں سکتا۔ فی الحال تُو یہ نہ دیکھ کہ آئندہ تجھے کیا نہیں ملے گا۔ اس بات کا شکر ادا کر کہ تجھے بہت کچھ مل رہا ہے۔ میں نے غصے میں کہا تھا' جب تک بطلیموس سے انتقام نہیں لوں گا' تجھ سے بات نہیں کروں گا۔ مگر میں تیرا بیٹا ہوں۔ میں نے تیری ممتا کے آگے اپنا غصہ تھوک دیا ہے۔ یہ تیری جیت ہے کہ تجھے اپنا بیٹا واپس مل گیا ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''اور یہ آرسی نوئی کی شکست ہے کہ اس کا بیٹا جیتے جی اس سے ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے۔''

''تیری دوسری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ میں بادشاہ نہ سہی... اس کا نائب بن گیا ہوں اور ایک علاقے کی نیابت مجھے مل گئی ہے۔ تجھے تو جشن منانا چاہئے۔''

اولمپیاس نے واقعی جشن منایا۔ اپنی سوکن کو جلانے کے لئے شہر بھر میں اتنے دیے جلائے کہ رات میں دن کا سماں پیدا کر دیا۔ آرسی نوئی واقعی جل رہی تھی' کڑھ رہی تھی۔ یہ تو بہت پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ اس کا بیٹا کبھی بادشاہ نہیں بن سکے گا۔ لیکن یہ اندیشے بڑھتے جا رہے تھے کہ سکندر حکمران بن کر اور زیادہ بااختیار ہوتا چلا جائے گا اور اس کے بیٹے کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔

وہ فیلقوس سے کہتی تھی۔ ''ایک تو بیٹا میری نظروں سے دور ہو گیا ہے۔ سکندر کا عروج کہہ رہا ہے' میں اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو دیکھ نہیں پاؤں گی۔ کبھی اس کی آواز



بھی نہیں سن سکوں گی۔ یہاں تیری ملکہ بننے کے خواب دیکھ کر آئی تھی۔ ایک ماں اپنی ساری زندگی' سارے خواب ہار سکتی ہے لیکن بیٹے کو ہارنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ میں تجھ سے ایک ہی التجا کرتی ہوں' سکندر کو دشمنی سے باز رکھ... میرے بیٹے کو سلامتی دے اور واپس بلا لے۔''

فیلقوس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہُوں... یہی فکر مجھے بھی کھائے جاتی ہے' میرے بعد بطلیموس کا کیا بنے گا؟ میری ساری فوجی قوت سکندر کے پاس ہو گی۔ وہ بطلیموس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ مجھے دوسرے بیٹے کی سلامتی کے لئے کچھ کرنا ہی ہو گا۔''

اس نے اسی رات سکندر کو طلب کیا اور کہا۔ ''جانِ پدر! کیا تجھے اندازہ ہے' میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ تیرے لئے کیا نہیں کرنا چاہتا؟''

وہ بولا۔ ''بے شک۔ میں تجھ پر فخر کرتا ہوں۔ جو کچھ تیرے دائرہ اختیار میں ہے' تُو مجھے دیتا جا رہا ہے۔''

''کیا میں تجھ سے کچھ مانگوں تو مجھے دے گا؟''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''یہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟ تجھے مانگنا نہیں' حکم دینا چاہئے۔''

''نہیں بیٹے! میں اس وقت حکمران نہیں' صرف ایک باپ بن کر اپنے دوسرے بیٹے کی زندگی مانگ رہا ہوں۔ بطلیموس لاکھ چھپنے کے باوجود آئندہ تیرے دائرہ اختیار میں ہو گا۔ میں چاہتا ہوں' اس کے خلاف غصہ تھوک دے۔ سنبوری کا خون معاف کر دے۔ اسے شاہی محل سے اور اپنے ماں باپ سے دور رہنے کی سزا مل چکی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار تجھ سے اپنے ایک بیٹے کی زندگی مانگ رہا ہوں۔''

وہ باپ کے آگے گھٹنے ٹیک کر بولا۔ ''مجھے شرمندہ نہ کر۔ میں تیری خاطر اسے معاف کرتا ہوں۔ میں اسے گلے تو نہیں لگاؤں گا مگر یہ وعدہ ہے' میری طرف سے کبھی اسے جانی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

فیلقوس نے خوش ہو کر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام لیا۔ پھر اسے اٹھا کر اپنے

سینے سے لگالیا۔اس کے دل سے دو بیٹوں کی عداوت کی جان لیوا فکر بڑی حد تک کم ہوگئی تھی۔آئندہ وہ ان کے درمیان رہی سہی رنجشیں بھی ختم کرسکتا تھا۔

اولمپیاس خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ بیٹا اگرچہ پوری سلطنت کا بادشاہ نہیں بنا تھا لیکن اسے نیم بادشاہت مل چکی تھی۔ وہ ملکہء مادرِ شاہ بن کر پورے محل میں بڑے غرور سے دندناتی پھرتی تھی۔ من چاہے احکامات صادر کرتی رہتی تھی۔اس کی کوشش تھی کہ بیٹا بھی حکومتی معاملات میں اس کے زیر اثر رہے۔

وہ کتنے ہی معاملات میں اسے روکتی ٹوکتی رہتی تھی۔ سکندر کبھی کوئی بات مان لیتا تھا اور کبھی ٹال دیتا تھا۔ایک دن اس نے بیٹے سے کہا۔"سرحد پار جو قبیلے آباد ہیں، انہیں قابو میں رکھنے کے لئے وہاں ہماری کوئی میدانی فوج نہیں ہے۔ وہ لوگ شاہ مقدونیہ کے خلاف فتنہ وفساد پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ہماری سرحدوں میں آتے ہیں اور آس پاس کی بستیوں کو لوٹ کر چلے جاتے ہیں۔ تجھے فوراً ان کی سرکوبی کے لئے جانا چاہئے۔"

سکندر نے کہا۔"بے شک۔ ان باغیوں کو سر کچلنا چاہئے۔لیکن اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے شاہ فیلقوس کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔"جب تجھے یہاں کا مختارِ کل بنا دیا گیا ہے تو پھر اپنے باپ کا محتاج کیوں بن رہا ہے؟ کیوں اس سے اجازت لے گا؟ تُو اپنی سرحدوں کی سلامتی کے لئے باغیوں پر فوج کشی کرسکتا ہے۔"

"بے شک۔تُو درست کہتی ہے مگر میں شاہ کا نائب ہوں۔ قانوناً شاہ فیلقوس سے اجازت طلب کرنی ہی ہوگی۔ میں تیری بات مان رہا ہوں۔لیکن مجھے قانون کی حد میں رہ کر پہلے مجھے اجازت حاصل کرنے دے۔"

بیٹا درست کہہ رہا تھا۔ ماں اسے تسلیم کر رہی تھی مگر اسے یہ منظور نہیں تھا کہ وہ شاہ فیلقوس کا غلام بن کر رہ جائے۔اس کے دماغ میں یہ بات پکتی رہتی تھی کہ کس طرح بیٹے کو باپ کے اثر سے نکالے؟ ان دنوں فیلقوس اس کی توہین کر رہا تھا۔اس کی



خوابگاہ میں نہیں آتا تھا۔ بات تک کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ایسا لگتا تھا، جیسے فیلقوس نے اسے اپنی شاہانہ زندگی سے باہر تھوک دیا ہے۔

فیلقوس نے سرحد پار کے باغیوں کے بارے میں سنا تو بیٹے سے کہا۔"تیری ماں نے تجھے فوج کشی کا درست مشورہ دیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ مشورہ درست ہونے کے باوجود تُو مجھ سے اجازت طلب کر رہا ہے۔"

فیلقوس نے اس کے سپہ سالار اینٹی پیٹر کو بلا کر حکم دیا۔"فوج کو کل صبح یہاں سے روانہ ہونے کا حکم دو۔ میرے شہزادے کی روانگی کے وقت مکانوں اور دکانوں کو خوب سجایا جائے۔ شہر کی عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کو راستوں کے اطراف جمع کیا جائے۔ وہ میرے بیٹے کے لئے خوشی سے نعرے لگائیں گے اور اسے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں گے۔"

اولمپیاس یوں تو خوش تھی کہ بیٹے کو اتنے اہتمام سے میدانِ جنگ میں بھیجا جا رہا ہے۔مگر یہ دیکھ کر کڑھ رہی تھی کہ ہر معاملے میں باپ اس پر حاوی ہے۔ جب سکندر رخصت ہونے کے لئے اس کے پاس آیا تو اس نے کہا۔"آج تُو پہلی بار سر عسکر بن کر ایک مہم پر جا رہا ہے۔اس موقع پر میں تجھے ایک راز کی بات بتا رہی ہوں۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تُو عام انسانوں میں سے نہیں ہے۔"

سکندر نے ایکدم سے چونک کر اسے دیکھا۔وہ بولی۔"اگرچہ تُو بیٹا ہے تاہم شاہ فیلقوس سے برتر ہے۔ وہ تیرے قدموں کی دھول بھی نہیں ہے۔"

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔"یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟"

"یہی تو ایک راز ہے جو اب تک میرے سینے میں دفن تھا۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے، میں ساموتھریس کے مندر کی پجارن رہی ہوں، اس مندر کے دیوتا ہم جیسے فانی انسانوں کے روبرو نمودار ہوتے ہیں۔ جب تیرے باپ سے شادی ہوئی تو میں نے سہاگ کی پہلی رات اس سے الگ رہ کر گزاری تھی۔اس کی وجہ نہ وہ جانتا ہے، نہ اب تک میں نے کسی کو بتائی ہے۔"

ماں اپنی سہاگ رات کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اس رات جزیرے میں تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا' روشنی کی ایک کرن آسمان سے میری طرف آئی اور میرے وجود میں پھیل گئی۔ میں نے کھلی آنکھوں سے پہلی بار عظیم دیوتا زیوس کو دیکھا۔ انہی لحات میں' میں نے اپنی کوکھ میں تیری آہٹ محسوس کی۔''

سکندر بے چینی سے اپنی مٹھیاں بند کرنے اور کھولنے لگا۔ ماں نے کہا۔ ''میں یہ راز پہلی بار تجھے بتا رہی ہوں۔ تاکہ تجھے اپنی اصلیت اور عظمت معلوم ہو۔ تُو فیلقوس جیسے انسان کا نہیں' ایک عظیم اور مقدس دیوتا زیوس کا بیٹا ہے۔''

یہ سچی کہاوت ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ایسے وقت ایک داسی ایک ستون کے پیچھے کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ فیلقوس اس زہریلی عورت کے ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتا تھا' یہ چاہتا تھا کہ وہ سکندر کو زہریلا نہ بنائے۔ لہٰذا اس پر نظر رکھنے کے لئے اس کی دو چار جاسوس کنیزیں اولمپیاس کے آس پاس پھرتی رہتی تھیں۔

اس کنیز نے فیلقوس کے پاس آ کر اولمپیاس کی ساری باتیں اس کے کانوں میں پھونک دیں۔ وہ بیٹے کو بڑے ہی شاہانہ انداز میں فوج کے ساتھ رخصت کرنے کے بعد اس کی خوابگاہ میں آیا۔ اولمپیاس نے غرور سے سینہ تان کر کہا۔ ''میں جانتی تھی' میری کشش ضرور تجھے یہاں کھینچ لائے گی۔ آخر پرانی شراب ہوں۔ میری طلب میں کیسے نہ آتا؟''

اس کی بات پوری ہوتے ہی تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ ایک طمانچہ پڑا۔ اس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولا۔ ''زہریلی ناگن! تُو باپ اور بیٹے کے خون کا رشتہ کاٹ رہی ہے؟ اسے دیوتا زیوس کی اولاد کہہ رہی ہے؟ تیرے باپ نے بھی کبھی کسی دیوتا کو دیکھا ہے؟''

اس نے پھر ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہاتھ کی جگہ ہتھیار بھی ہو



سکتا ہے۔ تجھے نیزے سے چھلنی کیا جا سکتا ہے۔ تیری گردن اڑائی جا سکتی ہے۔ مگر اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ تُو نے سکندر جیسا بیٹا مجھے دیا ہے۔ تُو نے ہمارے خاندانی شجرے کو اور بیٹے سے باپ کی ولدیت کو ختم کرنے کی ناپاک سازش کی ہے۔ تجھے سزائے موت نہیں دوں گا مگر اس محل سے اور اپنی زندگی سے دھکے دے کر نکال دوں گا۔''

یہ کہتے ہی اس نے ایک لات ماری۔ وہ پیچھے جا کر فرش پر گر پڑی۔ اس نے حکم دیا۔ ''آج شام تک جتنا مال و اسباب سمیٹ سکتی ہے' سمیٹ کر یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلی جا... آئندہ تُو بیٹے سے نہ کبھی تنہائی میں مل پائے گی' نہ اسے میرے خلاف بہکا سکے گی۔''

اس نے پہلے طمانچے کھائے پھر لات کھائی۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی توہین ہو سکتی ہے۔ وہ غصے اور نفرت سے بولی۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں' مجھے یہاں سے کیوں نکال رہا ہے؟ میرے جاتے ہی اس نئی نویلی قلوپطرہ کو محل میں لے آئے گا۔''

''بے شک' اسے لاؤں گا۔ اگر تُو یہاں سے نہ گئی تو تجھے قلوپطرہ کی داسی بنا دوں گا۔ جو حکم دیا ہے' فوراً اس کی تعمیل کر۔''

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ دروازے پر رک کر بولا۔ ''تُو نے کئی بار یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں کس بیوی کو ملکہ بناؤں گا....؟ تُو جلد ہی سنے گی کہ قلوپطرہ ملکہ بن چکی ہے۔''

اس نے اولمپیاس کے اندر یہ دھاکا کیا اور بڑے ہی شاہانہ انداز میں لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے باپ کو بیٹے کی نظروں سے گرانا چاہا تھا۔ فیلقوس اسے ایک ملکہ کی شان و شوکت سے اور تاج و تخت کی بلندی سے نیچے گرا کر چلا گیا تھا۔

سکندر اپنے استاد ارسطو کے نظریات کو یاد رکھتا تھا۔ وہ فلسفی کہتا تھا۔ ''بے شک ہم خوف سے یا عقیدت سے دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

آج تک کسی نے ان کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی ہے۔"

اور اولمپیاس نے دیوتا زیوس سے جسمانی رشتہ جوڑنے کا فسانہ سنا دیا تھا۔ ماں کی زبان میں سچائی ہوتی ہے۔ مگر حسد، جلن اور رقابت نے سمجھا دیا تھا کہ ان مراحل میں ایک ماں بھی باپ کے خلاف نفرت سے جھوٹ بولتی ہے۔ اولمپیاس نے فیلقوس کو نظروں سے گرانے کے لئے بہت بڑا جھوٹ کہا تھا لیکن یہ تیر نشانے پر نہیں بیٹھا تھا۔ بیٹا سنی اَن سنی کر کے چلا گیا تھا۔

وہ بہت جلد ایک فاتح کی حیثیت سے واپس آیا تو ماں کو محل میں نہیں پایا۔ فیلقوس نے کہا۔ "تُو نے پہلی بار فاتح بن کر میرا سر بلند کر دیا ہے۔ مگر افسوس....! اس خوشی کے موقع پر میں نے تجھے ایک ماں سے محروم کر دیا ہے۔ جو عورت باپ اور بیٹے کے خون کا رشتہ کاٹنے پر تل جائے، اسے کوئی بھی مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے اور اس محل سے بے دخل کر دیا ہے۔"

"تُو اس سے رشتہ توڑنے میں حق بجانب ہے۔ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ میں اس سے مل سکتا ہوں۔"

"بے شک۔ تُو جب چاہے، اس سے ملاقات کر سکتا ہے۔ ایسے وقت میرے جاسوس یا کنیزیں تیرے ساتھ رہا کریں گی۔ تا کہ وہ تجھے میرے خلاف پھر کوئی زہر نہ پلا سکے۔"

وہ اپنی ماں سے ملنے گیا۔ خیال تھا، وہ اپنے میکے واپس چلی گئی ہوگی۔ لیکن اپنا بہت کچھ ہارنے والی اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ کسی سے بات کرنا، کسی سے بھی سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک قبرستان کے قریب پرانے محل میں آ کر رہنے لگی تھی۔ سکندر وہاں پہنچا تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کے بدن سے زرق برق شاہی لباس اتر چکا تھا۔ وہ ایک سیاہ لبادے میں تھی۔ بیٹے کو دیکھتے ہی اس نے چہرے پر نقاب ڈال لیا۔

پہلے وہ آگے بڑھ کر اسے چوم لیا کرتی تھی۔ اس وقت اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔



"بس... وہیں رک جا۔ میں کسی کو اپنی صورت نہیں دکھاتی، کسی سے بات نہیں کرتی۔ تُو بیٹا ہے۔ اس لئے تجھ سے بول رہی ہوں اور تجھ سے پوچھ رہی ہوں، ایک ماں سے اس کی عزت اور اس کا مان مرتبہ چھین لیا جائے تو ایسے وقت بیٹے کو کیا کرنا چاہئے؟"

وہ بولا۔ "تُو پھر بیٹے کو باپ کے خلاف بھڑکانے والی بات کر رہی ہے۔ یہ تیرا اور فیلقوس کا معاملہ ہے۔ مجھے بیچ میں نہ ڈال۔ تجھے اپنے شوہر سے عزت نہ ملی۔ میرا وعدہ ہے، ایک بیٹا اپنی ماں کو عزت اور مان مرتبہ دے گا۔ تجھے خوش ہونا چاہئے کہ میں نے نیابت کا شاہی تخت سنبھالنے کے بعد باغیوں کے خلاف پہلی جنگ لڑی اور فاتح بن کر واپس آیا ہوں۔"

اولمپیاس نے آگے بڑھ کر بیٹے کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ پھر بڑے ہی زہریلے لہجے میں کہا۔ "وہ مرے گا... ضرور مرے گا اور جلد ہی مرے گا۔ میں اس کی پوری سلطنت کو تیرے قدموں میں دیکھ رہی ہوں۔"

سکندر خوب سمجھتا تھا کہ اس کی ماں ہار ماننے والی نہیں ہے۔ پتہ نہیں، آئندہ کیا کرنے والی ہے؟ وہ وہاں زیادہ دیر رک نہیں سکتا تھا۔ فیلقوس کی جاسوس کنیزیں اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ماں کی پیشانی کو چوم کر واپس چلا آیا۔

ڈیماس تھینز یونان کا ایک بہت مشہور و معروف خطیب اور جمہوریت کا علمبردار تھا۔ اس کا ذکر پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے۔ وہ خطابت کے دوران فیلقوس کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا اور کہتا تھا۔ "فیلقوس جمہوریت کا دشمن ہے۔ اسے ملک گیری کی ہوس ہے۔ اسی لئے وہ ہمارے ملک یونان پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔"

ان دنوں یونان ایک درجن شہری ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے جنگیں لڑتے رہتے تھے۔ لیکن جب ایشیائی ممالک کے عساکر نے ان پر حملہ کیا تو وہ آپس کی عداوتیں بھول کر متحد ہو گئے تھے۔ ان کے اتحاد نے دشمنوں کو ایشیا کی طرف واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جنگ کا خطرہ ٹلنے کے بعد ان کا اتحاد ختم ہو گیا تھا، وہ ایک بار پھر ریاستوں میں بٹ گئے تھے اور پہلے کی طرح ایک دوسرے

سے برتری حاصل کرنے کے لئے آپس میں لڑنے مرنے لگے تھے۔

اس طرح وہ سیاسی لحاظ سے کمزور ہو رہے تھے۔ ڈیڑھ سو سال کی خانہ جنگی نے انہیں معاشی طور پر کمزور کر دیا تھا۔ فیلقوس بہت موقع شناس تھا۔ یہ طے کر چکا تھا کہ ایسے ہی وقت یونان پر حملہ کرنا چاہئے۔ اس نے ایسی چال چلی تھی، جس کے نتیجے میں وہ بکھری ہوئی ریاستیں متحد نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اس کے باوجود ڈیماس تھینز کے جذبات انگیز اور ہیجانی خطبوں نے محبانِ وطن کو کسی حد تک یکجا کر دیا تھا۔ محض دو چار ریاستوں کی فوجیں یکجا ہو کر مقدونوی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

فیلقوس نے اس جنگ میں سکندر کو اپنے ساتھ رکھا تھا اور اسے سپہ سالار ہفااسشن کے ساتھ رسالہ خاص میں خدمات انجام دینے کی اجازت دے دی تھی۔ فوج کی کمانداری میں جیسی چالاکی اور حکمت عملی ضرورت ہوتی ہے، وہ تمام خوبیاں فیلقوس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جب یونانی فوج مقابلے پر آئی تو اسے یوں لگا، جیسے مقدونوی فوج کہیں اچانک ہی غائب ہو گئی ہے۔ ان کے چند سپاہیوں نے دور دور تک گھوڑے دوڑائے۔ لیکن مقدونوی فوج کا کہیں سراغ نہ ملا۔

ایسے وقت ایک قاصد پکڑا گیا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ فیلقوس بلقان کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ اس کانے اور لنگڑے بادشاہ کی چالبازی تھی جسے یونانی سمجھ نہ پائے۔ جب وہ ذرا آگے بڑھے تو انہیں ایک چھوٹی سی مقدونوی فوج دکھائی دی۔ جو یقیناً ان کے مقابلے میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

یونانی فوج کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ بڑے ہی جوش و خروش سے نعرے لگاتے ہوئے حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھے تو پیچھے سے فیلقوس کا بھاری لشکر نمودار ہوا۔ حملہ آوروں کو آگے اور پیچھے دیکھ کر یونانیوں کے ہوش اڑ گئے۔ تاہم انہوں نے جی جان سے مقابلہ کیا۔ پہلے دن کی لڑائی میں بہت بڑا نقصان اٹھایا۔ جب رات کی تاریکی چھانے لگی اور جنگ بند ہوئی تو انہوں نے دیکھا، عقب سے حملہ کرنے والی فوج پھر واپس جا کر کہیں گم ہو گئی تھی۔



دوسری صبح یونانی فوج نے پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ بہت دور مقدونوی فوج یوں دکھائی دے رہی تھی، جیسے جنگ کے لئے ابھی تیار نہ ہو۔ فوج کے سپاہی وادی میں بکھرے ہوئے تھے۔ سامان اٹھائے ادھر سے ادھر جا رہے تھے اور کھانے پینے میں مصروف تھے۔ دوپہر ہونے تک وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر شاہ بلوط کے جنگل میں ایک اونچے مقام پر پہنچ گئے اور فیلقوس کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

وہ اپنی فوج کا ایک دستہ دوسری سمت لے گیا تھا۔ وہاں جنگ چھڑ گئی تھی۔ ادھر سکندر اپنے سپہ سالار ہفااسشن اور تمام فوجی دستوں کے ساتھ بے چین تھا۔ فیلقوس انہیں آگے بڑھنے کا حکم نہیں دے رہا تھا۔ ایسے وقت سپہ سالار سے لے کر سپاہیوں تک، سب ہی بپھرے ہوئے تھے۔ سکندر کے جسم میں ایک ایک رگ ایسے پھڑک رہی تھی، جیسے پھٹ جائے گی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اب تب میں وہ خود پھٹ پڑے گا اور حکم کا انتظار کئے بغیر گھوڑا دوڑاتا ہوا باپ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو جائے گا۔

اس کا گھوڑا بیوسی فالس اس کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ اس گھوڑے کی تاریخی اہمیت تھی۔ وہ سکندر کی سپاہیانہ تربیت کی ابتداء سے اس کے ساتھ تھا۔ ہر جنگی مہم میں اپنے آقا کو پیٹھ پر اٹھائے ننگی تلواروں اور نیزوں کے درمیان سے گزرتا رہا تھا۔ اس وقت بھی بیوسی فالس اپنے سوار کی بے چینی کو خوب سمجھ رہا تھا اور خود بھی بے چین ہو رہا تھا۔ پھر اس کا پیمانۂ صبر جیسے لبریز ہو گیا۔ وہ منہ اٹھا کر ہنہنایا اور اچانک ہی جست لگا کر سپہ سالار اور سپاہیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا آندھی طوفان کی طرح فیلقوس کی طرف جانے لگا۔

سپہ سالار ہفااسشن نے سکندر کے گھوڑے کو بے قابو ہوتے دیکھا تو اس کے پیچھے دوڑا۔ ایسے میں فوج کیسے پیچھے رہتی؟ سب ہی نے دشمنوں پر ہلّہ بول دیا۔ اپنے کماندار فیلقوس کی جنگ میں شریک ہو گئے۔ خلافِ توقع گھمسان کا رَن پڑا۔ دور دور

تک لاشیں گرتی چلی گئیں۔ رات کا اندھیرا پھیلا تو میدانِ جنگ میں ایسی خاموشی چھا گئی' جیسے وہ گورستان بن گیا ہو۔ کہیں کہیں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وہ میدانِ جنگ واقعی قبرستان بن چکا تھا۔ جہاں نظر جاتی تھی' وہاں لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔

سکندر نے ان لاشوں کے درمیان لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھا۔ سب ہی لنگڑے ایک ہی طرح چلتے ہیں۔ لیکن وہ باپ کی چال کو پہچانتا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو واقعی فیلقوس نشے میں دھت دکھائی دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں شراب کی چرمی بوتل تھی۔ وہ ان لاشوں کے درمیان کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جب سکندر نے اسے آواز دی تو اس نے تڑپ کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''جانِ پدر! تُو زندہ ہے...؟ میں دیوتاؤں کو سونے چاندی کی بھینٹ چڑھاؤں گا۔ میرا بیٹا زندہ ہے۔''

باپ بیٹے آگے بڑھ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ سکندر نے پوچھا۔ ''تُو مجھے ان لاشوں کے درمیان ڈھونڈ رہا تھا؟''

''ہاں۔ میں نے افواہ سنی تھی' تُو مارا گیا ہے۔ آہ...! میں تو جیسے آدھا مر چکا تھا۔ شراب پی کر توانائی حاصل کر رہا تھا۔''

وہ بول رہا تھا اور بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹول رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا' بیٹے نے کتنے زخم کھائے ہیں؟ اس نے کہا۔ ''جب میں تیری طرح جوان تھا تو ایسے ہی گہرے زخم کھانے کے باوجود تن کر کھڑا رہتا تھا۔''

وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہوئے بولا۔ ''سپہ سالار ہفا اسٹن کہہ رہا تھا' تُو نے میرے حکم کا انتظار نہیں کیا اور جنگ کا پانسہ پلٹنے سے پہلے ہی ہلہ بول دیا۔ تیری اس غلطی سے ہمارے سینکڑوں سپاہی مارے گئے ہیں۔''

وہ کبھی لاشوں کو پھاندتا ہوا' کبھی انہیں روندتا ہوا بیٹے کے ساتھ چل رہا تھا۔ جنگ کے دوران جو غلطیاں ہوئیں' ان کی مذمت کر رہا تھا۔ بیٹے کو سمجھا رہا تھا' آئندہ اسے



جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا چاہئے۔ ایسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے کہ اپنے سپاہیوں کا کم سے کم نقصان ہو۔

بیٹے کو نصیحت کرنے کے بعد وہ گنگناتا ہوا لاشوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ اگرچہ نشے میں بدمست تھا' لیکن اس کے دماغ پر شراب کا کوئی اثر نہ تھا۔ سکندر نے غور سے سنا تو فیلقوس کی گنگناہٹ میں ڈیماس تھینز کے خطبے کے چند فقرے سنائی دیئے۔ اس نے اپنے دشمن کے خطبوں کو یاد رکھا تھا۔ جبکہ وہ اسی کے خلاف تھے۔ وہ کہتا جا رہا تھا۔ ''بے چارہ... مجھ پر کیچڑ اچھالنے والا نہ جانے کہاں ہے؟ یہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''

ایک زخمی سپاہی نے آ کر بتایا کہ ڈیماس تھینز زندہ بچنے والے زخمی سپاہیوں کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔

یہ فیلقوس کی بہت بڑی فتح تھی۔ پورا یونان اس کے زیرِ اثر آ گیا تھا۔ وہ فتح کا جشن مناتے وقت شراب کا جام لنڈھاتے ہوئے کہتا تھا۔ ''اس فتح کا سہرا سکندر کے سر ہے۔ اس نے اگرچہ جنگی اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی تاہم اس کی اچانک پیش قدمی نے میری توقع کے خلاف جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ یہ شاندار فتح بے شک میرے بیٹے کی مرہونِ منت ہے۔''

اور سکندر سپاہیوں کے درمیان بیوسی فالس کو گلے لگا کر تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اس شاندار فتح کا سہرا میرے اس جاں نثار کے سر ہے۔ یہ میرے اضطراب اور جوش و جذبے کو سمجھ کر اچانک آگے نہ بڑھتا تو مجھے یہ عروج' یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی۔''

فیلقوس کے لشکر میں اطالوس ایک سپاہی تھا۔ اس نے بڑی بے غیرتی سے اپنی حسین بھتیجی قلوپطرہ کو اس عیاش بادشاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس طرح وہ ایک سپاہی سے ماتحت افسر بن گیا۔ جب فیلقوس نے قلوپطرہ سے شادی کی تو وہ ماتحت افسر سے بادشاہ کا مشیر بن گیا۔

سکندر اب ایک نادان نوخیز نوجوان نہیں رہا تھا۔ دو بڑی جنگیں لڑنے کے بعد سیاسی چالبازیوں کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ اطالوس کی مکاریوں کو بھی خوب سمجھ رہا تھا۔ لیکن باپ کی ہوس پرستی کے باعث مجبور تھا۔ اس معاملے میں اس کی اپنی ماں کا بھی قصور تھا۔ اولمپیاس اگر فیلقوس سے بنائے رکھتی تو قلوپطرہ کے لئے محل کے دروازے کبھی نہ کھلتے۔ ایک بیوی کی بدعقلی نے شوہر کو دوسری خندق میں گرا دیا تھا۔

اولمپیاس نے بیٹے سے کہا۔ ”میں تجھے سمجھاتی ہوں اور تُو سمجھتا ہے کہ تیرے باپ کے خلاف زہر اگل رہی ہوں۔ تیری آنکھیں ہیں، تیرے پاس دماغ ہے۔ خود ہی دیکھ اور خود ہی سمجھ.... مجھ سے تو علیحدگی ہو ہی چکی ہے۔ اب وہ دس عورتیں محل میں لے آئے۔ میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر تیرے لئے بہت فرق پڑنے والا ہے۔“

سکندر نے کہا۔ ”تُو فکر نہ کر۔ قلوپطرہ کی ادائیں اور اس کی جادوگری صرف محل کی چاردیواری تک ہی محدود رہیں گی۔ وہ اور اس کا چچا حکومتی معاملات میں مداخلت کریں گے تو پھر میں انہیں سزا دیتے وقت اپنے باپ کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔“

اولمپیاس نے کہا۔ ”تُو اب بھی نادان ہے۔ ٹھوکریں کھاتا رہے گا تو سیاست سمجھ میں آئے گی۔ ارے نادان....! محل کی چاردیواری کے اندر ہی سیاست پکتی ہے۔ وہ چالباز عورت اپنی کوکھ میں ایک ولی عہد کی کھچڑی پکا رہی ہوگی۔ جلد سے جلد ماں بننے کی تدبیریں کر رہی ہوگی۔ فیلقوس نے مجھ سے کہا تھا، وہ قلوپطرہ کو اپنی ملکہ بنانے والا ہے۔ کیا اس کے یہ ارادے خطرے کی گھنٹی نہیں بجا رہے ہیں؟“

سکندر نے سوچتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”اگر وہ ملکہ بن جائے گی تو ظاہر ہے، اس کی کوکھ سے پیدا ہونے والا بیٹا ہی فیلقوس کا ولی عہد بنے گا، اسی کو تخت پر بٹھایا جائے گا، اسی کے سر پر تاج سجایا جائے گا۔“

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔ میں نے اتنی دور تک نہیں سوچا تھا۔“

وہ بولی۔ ”بیٹے! میری ایک بات گرہ میں باندھ لے اور دو باتیں اچھی طرح یاد



رکھ.... سیاست میں دور تک سوچ اور سوچنے میں کبھی دیر نہ کر۔ بھائی تو سوتیلا ہے ہی.... کبھی سگے باپ پر بھی بھروسہ نہ کر۔“

وہ ذرا قریب آکر بولی۔ ”فیلقوس صرف کانا نہیں، بڑا کائیاں بھی ہے۔ وہ آگے سے تیرا سر سہلا رہا ہے، پیچھے سے دھکا دے رہا ہے۔ ایسی کھائی میں گرا رہا ہے، جہاں سے تُو ولی عہد بننے کے لئے ابھر کر نہ آسکے گا۔“

سکندر دل ہی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ باپ جان بوجھ کر نہ سہی انجانے میں تخت و تاج کا ایک دشمن پیدا کرنے والا ہے۔ ماں نے کہا۔ ”آج تقدیر تیرے باپ کو سربلندی عطا کر رہی ہے۔ تُو سیاست سے کام لے گا تو اس کا سر گرے گا اور تیرا سر بلند ہوگا۔“

وہ بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”مجھے تیری فکر کھائے جاتی ہے۔ پہلے تو آرسی نوئی اور اس کا بیٹا تھا۔ اب قلوپطرہ تیرے مقابلے میں ولی عہد پیدا کرنے آرہی ہے مگر میں ان سوکنوں سے مات کھانے والی نہیں ہوں۔ جب تُو میرے بطن میں تھا، تب میں نے ایک عظیم دیوتا کے سامنے یہ حلف اٹھایا تھا کہ ہر حال میں تیری حفاظت کروں گی۔“

پھر وہ سوچتی ہوئی نظروں سے خلا میں دیکھنے لگی۔ بڑے یقین سے کہنے لگی۔ ”عظیم دیوتا کی قسم....! میں تجھ پر آنچ آنے سے پہلے ہی انگارے بچھانے والوں کو ختم کر دوں گی۔“

وہ زہریلی تھی، کچھ بھی کر سکتی تھی۔ بلکہ بہت کچھ کر چکی تھی۔ بیٹے کے دل میں ایسے وسوسے ڈال دیئے تھے، جو اسے بے چین کر رہے تھے۔ باپ پر سے بڑی حد تک اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ پھر اس روز یہ بے اعتمادی اور جڑ پکڑ گئی۔ جب یہ خبر پھیلی کہ قلوپطرہ ماں بننے والی ہے۔

فیلقوس نے ایک رات اس خوشی میں خوب جشن منایا۔ اس جشن میں امراء، مصاحبینِ خاص فوج کے اعلیٰ عہدیدار موجود تھے۔ فیلقوس شیر کے تاج والی مسند پر

بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تنہا اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا کرتا تھا لیکن اس رات اس نے قلوپطرہ کے چچا اطالوس کو اپنے پاس بٹھا کر اسے اپنی برابری کا اعزاز دیا۔ یہ بات سکندر کو ناگوار گزر رہی تھی۔

اور یہ ناگواری کی بات ہی تھی۔ لشکر کا ایک معمولی سپاہی اپنی خوبصورت بھتیجی کو زینہ بنا کر فیلقوس کے برابر آ بیٹھا تھا۔ فوج کے اعلیٰ عہدیدار اب بھی اسے کمتر سپاہی سمجھتے تھے۔ یوں ایک بادشاہ کی برابری انہیں بھی ناگوار گزر رہی تھی لیکن وہ کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ سکندر سے توقع تھی کہ شاید وہ اعتراض کرے گا مگر وہ بھی اپنے باپ کو گھور کر رہ گیا تھا۔

فیلقوس شراب کی بدمستی میں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا' جیسے وہ نشے میں نہیں ہے۔ اس کے برعکس اطالوس شراب پی کر بدمست ہو رہا تھا۔ اپنی اوقات بھول کر فوج کے افسران کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے سکندر سے کہا۔ ''یہ شاہ کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھایا ہے۔ مگر تُو اتنی دور ہے' جیسے کوئی فاضل چیز اٹھا کر پھینک دی گئی ہو۔''

سکندر نے باپ سے کہا۔ ''یہ تیرا ہم نشیں بے لگام ہو رہا ہے۔ اس سے کہہ دے' میرے متعلق کوئی رائے پیش نہ کرے۔''

فیلقوس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! شراب و کباب کی محفل میں ایسا ہوتا ہے۔ شراب کے نشے میں پر لگ جاتے ہیں۔ سب ہی ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تجھے برداشت کرنا چاہئے۔''

ایک بزرگ مصاحب نے سکندر کے شانے کو تھپک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''درگزر کر... اطالوس اپنی اوقات بھول رہا ہے۔ تیری شاہانہ عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کے منہ نہ لگ...''

اس بھیڑ میں دو چار حسینائیں رقص کر رہی تھیں۔ موسیقی کی آواز ابھر رہی تھی۔ لوگوں کی باتوں کا شور بھی تھا۔ اطالوس نے ایک ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو ساز بجانے



والے رک گئے۔ باتیں کرنے والے بھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ شراب کا بھرا ہوا جام اٹھا کر فیلقوس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تجھ پر دیوتاؤں کا سایہ رہے۔ تُو میری بھتیجی کو فرش سے عرش پر لے آیا ہے۔ اب اس ماں بننے والی خبر نے اس کی عزت اور عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔''

پھر اس نے دو گھونٹ پی کر دور کھڑے ہوئے سکندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے عظیم دیوتا کو چڑھاوے چڑھائے ہیں۔ یہ یقین سے کہتا ہوں' میری بھتیجی قلوپطرہ ایک بیٹے کو جنم دے گی۔''

وہ حاضرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا... یعنی کہ... یعنی کہ... ایک ولی عہد کو جنم دے گی۔''

اس بات پر سب ہی چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کہتے ہوئے سکندر کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اندر ہی اندر اس بات پر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس کا باپ ایسی بے تکی بات کہنے سے اطالوس کو روک نہیں رہا ہے۔

قلوپطرہ نے ماں بننے والی بات کہہ کر اطالوس کو پھولا ہوا غبارہ بنا دیا تھا۔ وہ حاضرین سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ خبر عام ہے اور مصدقہ ہے کہ سکندر دیوتا زیوس کا بیٹا ہے۔ لہٰذا ولی عہد تو وہ بیٹا ہوگا' جسے مقدونیہ کی ملکہ یعنی میری بھتیجی جنم دینے والی ہے۔''

صبر کا پیالہ چھلک گیا۔ سکندر گرجتے ہوئے بولا۔ ''ذلیل انسان...! تُو مجھے فیلقوس کی ولدیت سے کاٹ رہا ہے؟ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ دوڑتا ہوا سامنے رکھی ہوئی میز پر چڑھ گیا۔ پھر وہاں سے اطالوس پر چھلانگ لگائی۔ سب لوگ دور کھڑے ہوئے تھے' کچھ اور دور ہو گئے۔ سکندر اس کی پٹائی کر رہا تھا۔ فیلقوس فوراً ہی ایک سپاہی سے تلوار لے کر نشے میں لڑکھڑاتا ہوا ان کے درمیان آ گیا۔ اس بڑھاپے میں اولاد پیدا کرنے کی خوشی ایسی تھی کہ اس نے پہلی بار ضرورت سے زیادہ پی لی تھی۔

اس نے بڑی نقاہت سے تلوار کو لہراتے ہوئے کہا۔ ''بس کر.... اب اسے ہاتھ

نہ لگانا...نہیں تو...نہیں تو....''

آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی نشے نے اسے گرادیا۔ وہ مسند کے زینے سے لڑھکتا ہوا نیچے آگیا۔ فوج کے دو اعلیٰ افسر آ کر اسے اٹھانا چاہتے تھے۔ سکندر نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''خبردار...! کوئی اسے نہیں اٹھائے گا۔ یہ تخت سے گرتا ہوا نیچے آیا ہے' خود اٹھ کر اوپر جائے گا۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا حاضرین کے درمیان سے گزرتا ہوا دروازے تک آیا۔ پھر پلٹ کر باپ کو دیکھا۔ درۂ دانیال کے پاس پہاڑی راستے میں فیلقوس کو حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کا کولہا اتر گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا باپ کو سہارا دینے آیا تھا۔ آج وہی باپ گرا ہوا تھا لیکن بیٹے نے اسے سہارا نہیں دیا۔

اس نے بلند آواز میں تمام حاضرین سے کہا۔ ''لوگو...! دیکھو...اور سمجھو...جو شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر تخت کے پائے تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیا وہ تخت پر بیٹھنے کا اہل ہو سکتا ہے....؟ سوچو....آنے والا وقت جلد ہی تمہیں جواب دے گا....''

یہ کہہ کر وہ بڑے ہی شاہانہ انداز میں پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔ یہ انداز بتا رہا تھا کہ حالات نے سکندر کو چنگاری سے ایک شعلہ بنا دیا ہے۔

===✿===



حالات کے نشیب و فراز نے اور باپ کے بدلتے ہوئے تیور نے سکندر کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ اگر وہ اور زیادہ اس محفل میں ٹھہرتا تو شاید باپ اور بیٹے کے رشتے کو جلا کر راکھ کر دیتا۔

وہ بیوسی فالس کو دوڑاتا ہوا محل سے نکل کر ماں کے پاس آگیا۔ ماں بیٹے کی ملاقات کا ایک وقت مقرر رہتا تھا۔ اولمپیاس اس کی بے وقت کی آمد پر چونک گئی۔ بیٹے کے بگڑے ہوئے تیور چھٹی حس کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔

''تُو اس وقت یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

''تجھے لینے آیا ہوں۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میں پیلا سے جا رہا ہوں اور تجھے میرے ساتھ چلنا ہے۔''

اس نے بے یقینی سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پیلا سے جا رہا ہے؟ مگر کیوں جا رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟''

''پیلا شہر سے باہر ہمارا ایک خاندانی مکان خالی پڑا ہے۔ تُو میرے ساتھ وہاں رہے گی۔''

''میرا بیٹا مجھے جہاں لے جائے گا' جہاں بھی رہنے کو کہے گا' میں رہ لوں گی۔ مگر کچھ پتہ تو چلے۔ آخر معاملہ کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''استادِ محترم نے سمجھایا ہے کہ جب بھی غصہ آئے تو تم کتے کی طرح

بھونکنے کے بجائے خاموشی اختیار کرو۔لہٰذا مجھے خاموش رہنے دے۔"

اولمپیاس بیٹے کی فطرت سے خوب واقف تھی۔یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب وہ کوئی بات چھپانے پر آتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی زبان کھلوا نہیں سکتی۔اس نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ضروری سامان باندھ کر ایک خادمہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہوگئی۔سکندر اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔وہ سب راتوں رات پیلا شہر کی حدود سے نکل کر اس خالی مکان میں آگئے۔

اولمپیاس بظاہر خاموش تھی۔مگر اندر ہی اندر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔بیٹے کا یوں محل چھوڑ کر چلے آنا' گلے میں ہڈی کی طرح اٹک رہا تھا۔سکندر صبح تک اس کے پاس رہا پھر بیوسی فالس پر سوار ہو کر باہر جانے لگا۔ماں نے پوچھا۔"اب کہاں جا رہا ہے؟"

وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے بولا۔"جہاں بھی جا رہا ہوں۔لوٹ کر یہیں آؤں گا۔"

بیٹے نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔وہ گھوڑا دوڑتا ہوا' دھول اڑاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔وہ اڑتی ہوئی دھول کو ایسے دیکھ رہی تھی' جیسے پھیلتے ہوئے غبار میں اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہی ہو۔

شاہی محل میں اس کے کئی وفادار موجود تھے۔ان کے ذریعہ وہاں کی ہر چھوٹی بڑی بات اولمپیاس کے کانوں تک پہنچتی رہتی تھی۔یوں کہنا چاہئے کہ وہ دور رہ کر بھی اس شاہی محل کی جڑوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔لہٰذا باپ بیٹے کا معاملہ بھی اس سے چھپا نہ رہ سکا۔

شام کے بعد سکندر واپس آیا تو اس نے کہا۔"میدانِ جنگ سے فرار ہونے والا سپاہی کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔تُو نے دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اچھا نہیں کیا۔اس طرح انہیں اور شہ ملتی رہے گی۔بات تو تب تھی' جب تُو اطالوس کو دھکے مار کر محل سے نکال دیتا۔"



وہ ناگواری سے بولا۔"کیسے نکالتا؟ جبکہ وہ اور اس کی بھتیجی دونوں ہی شاہ مقدونیہ کے چہیتے رشتہ دار بنے بیٹھے ہیں۔"

"تیرے یوں منہ پھیر کر چلے آنے سے وہ اور زیادہ چہیتے بن جائیں گے۔دشمن کے لئے میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہئے۔تُو نے ابھی صرف پیلا کی نیابت سنبھالی ہے۔یہ تیری کامیابی نہیں ہے۔تیری منزل تو ولی عہدی اور اس کے بعد تخت نشینی ہے۔"

"میں اپنے حقوق سے منہ پھیر کر نہیں آیا ہوں۔وقتی طور پر اس محل سے اور اپنے باپ سے دور ہو گیا ہوں۔"

"فیلقوس الٹے دماغ کا آدمی ہے۔تیری غیر موجودگی میں وہ کوئی بھی نیا فیصلہ سنا سکتا ہے۔"

سکندر اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔وہ بولی۔"اطالوس بھی اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا۔اس کی بھتیجی نے ایک بیٹے کو جنم دیا تو وہ اسے فیلقوس کا جانشین بنانے کے سلسلے میں سر توڑ کوششیں کرے گا۔عین ممکن ہے' فیلقوس تیرے روّیے سے بدظن ہو کر قلوپطرہ سے کوئی وعدہ کر بیٹھے۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔"تُو ٹھیک کہہ رہی ہے۔مجھے دشمنوں کو کھلی چھوٹ نہیں دینی چاہئے۔"

وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ایسے وقت خادمہ نے آکر بتایا کہ محل سے ایک قاصد آیا ہے۔اولمپیاس نے تعجب سے کہا۔"قاصد...؟"

سکندر نے اسے اندر آنے کا حکم دیا۔وہ ان کے سامنے آکر ادب سے جھکتے ہوئے بولا۔"تم دونوں پر عظیم دیوتاؤں کا سایہ رہے۔"

سکندر نے پوچھا۔"تجھے کیسے علم ہوا کہ ہم یہاں ہیں؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔"بادشاہ اپنی سلطنت کے چپے چپے کی خبر رکھتا ہے۔اس کے خاص آدمی تیری نگرانی کرتے رہتے ہیں۔اس نے یہ نامہ تیرے نام بھیجا ہے۔"

اس نے ایک شاہی فرمان نامہ اس کی طرف بڑھا دیا۔سکندر اسے لے کر پڑھنے

لگا۔ اس میں لکھا تھا۔ ”جانِ پدر...! جو ہوا سو ہوا....رات گئی‘ بات گئی....ایک بادشاہ کے سر پر حکمرانی کا نشہ طاری رہتا ہے اور باپ کی محبت اس نشے کو ہرن کر دیتی ہے۔ یہاں مشیروں اور اعلیٰ عہدیداروں میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ وہ میرے منہ پر کچھ نہیں کہتے مگر ان کی باتیں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔

سب یہی سوچ رہے ہیں‘ یہی کہہ رہے ہیں کہ شاہ مقدونیہ جب اپنے گھر والوں کو متحد نہیں رکھ سکتا تو نئی جمعیت متحدہ یونان کے فرائض سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکے گا؟ ان کی تشویش کا اور ان کے سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ میرا بیٹا سکندر واپس آ جائے اور فوج میں اپنا عہدہ سنبھال لے۔“

اس نے وہ نامہ اولمپیاس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے پڑھ کر ذرا مطمئن ہوئی۔ فخر بھی حاصل ہوا کہ بیٹا اپنے باپ کی ضرورت ہے۔ مگر ایک ذرا تشویش میں مبتلا ہو کر بولی۔ ”میں فیلقوس کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ جب کسی کی ٹانگ کھینچنی ہو‘ تب ہی وہ اس کے آگے جھکتا ہے۔ وہ بہت ہی خود غرض اور چالباز ہے۔ اپنے مشیروں اور اعلیٰ عہدیداروں کا منہ بند کرنے کے لئے تجھے بلا رہا ہے۔ نہ میں جانتی ہوں‘ نہ تُو جانتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”تیرا بیٹا سپاہی ہے۔ میدانِ جنگ میں جاتے وقت یہ نہیں سوچتا کہ دشمن کیسی چالبازی اور کیسی تلوار بازی دکھائے گا؟ میں تو وہاں بھی اپنی عقل‘ اپنی حکمت عملی اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ کر کے مقابلے پر ڈٹ جاتا ہوں۔“

اس نے ماں کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تُو چاہتی ہے ناں کہ میں پیلا کی نیابت پر اپنی گرفت مضبوط رکھوں؟“

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ”تو پھر میں جا رہا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ تجھے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے‘ آسمانی طاقتیں تیری حفاظت کریں گی۔ ہر خطرے سے تجھے بچائیں گی‘ تُو ان طاقتوں پر بھروسہ رکھ‘ جو انسانوں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ ان طاقتوں کے سائے میں ماں



کی دعائیں بھی تیرے ساتھ ہیں۔“

اس نے بیٹے کی پیشانی کو چوم کر اسے رخصت کر دیا۔ فیلقوس درباریوں کے ہجوم میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے بیٹے کو دیکھتے ہی اپنی مسند سے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ سکندر نے کہا۔ ”تُو مجھے گلے لگا رہا ہے۔ لیکن میں گلا کاٹنے والے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ اطالوس کو بول...‘ یہاں سے چلا جائے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ایک ذرا سی بات پر اتنا غصہ نہ دکھا۔ اطالوس نے نشے کی حالت میں تجھے دیوتا زیوس کا بیٹا کہا تھا۔ کسی کے کہنے سے باپ بیٹے کے خون میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“

وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری ماں نے بھی یہی کہا تھا کہ میں تیرا نہیں‘ دیوتا زیوس کا بیٹا ہوں اور تُو آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ تُو نے میری ماں کو اپنے محل سے اور اپنی زندگی سے نکال دیا۔ آج وہی بات اطالوس کہہ رہا ہے۔ لہٰذا اسے بھی محل سے بھگا دے۔ یا پھر میری ماں کو واپس بلا لے۔“

اس نے اپنی اکلوتی آنکھ سے بیٹے کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”میں تھوکا ہوا نہیں چاٹتا۔ جسے تھوک دیا تو پھر تھوک ہی دیا۔ ولدیت کی یہ آگ تیری ماں کی لگائی ہوئی ہے۔ اطالوس نشے کی ترنگ میں منہ پر کہہ گیا۔ دوسرے پیٹھ پیچھے بولتے رہتے ہیں۔ میں کس کس کو محل سے بھگاؤں؟ کتنوں کا منہ بند کروں؟“

سکندر نے سر جھکا لیا۔ وہ دل میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ اولمپیاس نے اتنا بڑا جھوٹ بول کر لوگوں کو افواہیں پھیلانے کا موقع دے دیا ہے۔ فیلقوس ایک آنکھ سے کبھی اپنے بیٹے کو اور کبھی دور بیٹھے ہوئے اطالوس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سکندر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اطالوس نے اگرچہ نشے میں کہا مگر غلط کہا۔ تُو میرا بیٹا ہے‘ میری طرح تجھے بھی غصہ آنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں‘ تُو میرا لحاظ کر رہا ہے۔ ورنہ اس بدبخت کو قتل کر دیتا۔ میں بھی تیرا لحاظ کرتا ہوں۔ تُو اس کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہ آئندہ کبھی تیرے سامنے نہیں آئے گا۔“

اس نے سر گھما کر اطالوس کو دیکھا۔ پھر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جا... یہاں سے چلا جا...تُو میرا مشیر رہے گا۔ لیکن میرے بیٹے کے روبرو کبھی نہیں آئے گا....آئے گا تو میں تیری زندگی کی ضمانت نہیں دوں گا۔''

اطالوس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تمام درباریوں پر ایک نظر ڈالی ۔وہ اپنی خوبصورت بھتیجی کے حوالے سے شاہ کا مصاحبِ خاص بن گیا تھا۔ سب سے اعلیٰ رُتبہ حاصل کرنے کے بعد اب اپنی توہین محسوس کر رہا تھا۔ بھرے دربار میں شاہ کے فیصلے پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

فیلقوس بیٹے کا ہاتھ تھام کر اپنی مسند پر آیا پھر بولا۔ ''اطالوس نے شراب و کباب کی محفل میں یہ کہہ کر صرف تیری ہی نہیں، میری بھی توہین کی تھی کہ میں تیرا باپ نہیں ہوں۔ میں نے بھرے دربار میں اس کی توہین کی ہے۔ اسے یہاں سے نکال دیا ہے۔ اب اپنے دل سے تمام کدورتیں نکال دے۔''

سکندر نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا پھر جھک کر اس کی ہتھیلی کی پشت کو چومتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھ جیسے باپ پر ناز کرتا ہوں۔ آج یقین ہو گیا کہ ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔''

فیلقوس نے اپنے سپہ سالار پارمینیو کو طلب کیا۔ پھر سکندر سے کہا۔ ''تُو جانتا ہے، پارمینیو کس قدر جیدار اور تجربہ کار جنگجو ہے۔ یہ جب بھی لشکر لے کر نکلتا ہے، میدان مار کر واپس آتا ہے۔ تجھے اس کے ساتھ ایشیائی مہم پر جانا ہے۔''

سکندر نے آگے بڑھ کر پارمینیو سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ''میری یہ دلی خواہش تھی کہ تیرے ساتھ رہ کر جنگی حربے سیکھتا رہوں۔ آج میری یہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔''

فیلقوس نے کہا۔ ''نئے ہتھیار اور نئی منجنیقیں تیار ہو چکی ہیں۔ تم دونوں کو یہاں سے جلد ہی روانہ ہونا ہے۔''

سکندر بہت خوش تھا۔ اس نے اولمپیاس کو یہ خوشخبری سنائی تو اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''تُو بہت ہی نادان ہے میرے بچے! ایشیائی مہم کے لئے اتنی جلدی روانہ ہونا



کوئی ضروری نہیں ہے۔ فیلقوس اس لئے جلد بازی دکھا رہا ہے کہ اسے قلوپطرہ سے ایک بیٹے کی توقع ہے۔ اگر بیٹا ہو گیا تو وہ تیری عدم موجودگی میں اس کی ولی عہدی کا اعلان کرے گا۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے اپنے آدمیوں سے یہاں کی خبریں ملتی رہیں گی۔ اگر ایسا اعلان ہوگا، میری حق تلفی ہوگی تو میں پوری فوج کے ساتھ واپس آ کر یہاں دھاوا بول دوں گا۔''

''میرے نادان بیٹے! سپاہ سالار پارمینیو بہت وفادار ہے۔ مگر وہ تیرا نہیں، فیلقوس کا وفادار ہے۔ وہ اپنے آقا پر کبھی لشکر کشی نہیں کرے گا۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیٹے کے قریب آئی۔ پھر بولی۔ ''تُو صرف جنگی حربے آزمانا جانتا ہے۔ کیا ارسطو نے تجھے سیاست نہیں سکھائی؟ تُو اپنے باپ کی اس سیاست کو نہیں سمجھ رہا۔ اس نے تیرے سر پر ہاتھ پھیرنے اور درباریوں کو خوش کرنے کے لئے اطالوس کو عارضی طور پر دربار سے نکالا ہے۔ تجھے جلد سے جلد اسی لئے ٹال رہا ہے کہ تیرے جاتے ہی اسے دوبارہ طلب کر سکے۔ قلوپطرہ کو خوش کرنے کے لئے اسے اپنے تخت کے ساتھ بٹھا سکے۔''

سکندر کے دل میں اس بات سے تشویش پیدا ہو گئی ۔وہ اپنے باپ کی مصلحت اندیشی کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ایسے وقت تذبذب میں رہتا تھا کہ ماں درست کہہ رہی ہے یا باپ اسے جنگجوئی اور حکمرانی کے راستے پر لگا رہا ہے؟ وہ اپنی مطالعہ گاہ میں آ کر سوچنے لگا۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ اسے اپنی ذہانت سے ماں باپ کے مزاج اور روّیے کو سمجھنا چاہئے۔

وہ خفیہ طور پر معلومات حاصل کرنے لگا کہ فیلقوس واقعی اسے نیک نیتی سے ایشیائی مہم پر روانہ کر رہا ہے یا صرف محل سے دور رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے جن مخبروں سے ایسی معلومات حاصل کرنا چاہیں، انہوں نے فیلقوس سے یہ بات کہہ دی کہ بیٹا اس کے روّیے پر شک و شبہات میں مبتلا ہے۔

ایک رات وہ لنگڑاتا ہوا بیٹے کی مطالعہ گاہ میں آیا۔ سکندر حسبِ معمول سونے سے پہلے مطالعے میں مصروف تھا۔ باپ کی آمد پر چونک گیا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ سکندر کے آس پاس کئی نوشتے اور مختلف مسودے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انہیں اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے ان کا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ ہتھیاروں کو تیز کیا جاتا ہے۔''

سکندر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''میری آرزو ہے کہ تم پارمینیو کے ساتھ فوج کی کمان کرو۔ میں چاہتا ہوں' تم مسائل کو سمجھنے اور لوگوں پر قابو پانے کے قابل ہو جاؤ۔ ڈرامے کے کسی کردار کی طرح شیریں گیت گانے یا ریاضی کے چکروں میں الجھے رہنے سے حکومت حاصل نہیں ہوتی۔ کہانیوں اور المیہ ڈراموں میں اچانک ہی ماں باپ یا دوست احباب یا دیوتا آ کر مشکلیں آسان کر دیتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لنگڑاتا ہوا ایک طرف گیا۔ پھر پلٹ کر بولا۔ ''اپنی ذہانت اور اپنی قوت ارادی سے ایک لنگڑا دو پیر والوں پر حکومت کرتا ہے۔ ارسطو سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ باپ سے بھی کچھ سیکھو۔ داشتہ ہو' بیوی ہو یا ماں ہو۔ وہ تلوار پکڑنا نہیں جانتی۔ البتہ سپاہی کے ہاتھ سے تلوار گرانا جانتی ہے۔ ماں کی چھاؤں میں صرف اس وقت جاؤ' جب تھکن سے چُور ہو جاؤ۔ باقی زندگی باپ کی طرح دھوپ میں جلتے ہوئے گزارو۔ تب ہی حکمرانی تمہارا مقدر بنے گی۔''

ایک ٹک باپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک آنکھ اور ایک ٹانگ والا حواس پر چھا جاتا تھا۔ اس کی ایک ایک بات دل میں نقش ہو جاتی تھی۔ وہ کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ لنگڑاتا ہوا دروازے تک گیا۔ پھر بولا۔ ''میں نے بڑے زخم کھائے ہیں۔ تیری بے اعتمادی کا ایک زخم اور لگے گا تو اُسے بھی سہہ لوں گا.....''

یہ کہتا ہوا وہ دروازے سے باہر گیا اور بیٹے کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ یوں متاثر کرتا تھا کہ اوجھل ہونے کے بعد اور زیادہ واضح ہو جاتا تھا اور زیادہ ذہن پر مسلّط



ہو جاتا تھا۔ اس نے صرف تلوار کے زور سے اپنی سلطنت نہیں بڑھائی تھی۔ وہ صرف میدانِ جنگ کا فاتح نہیں تھا۔ بلکہ اپنے دماغ سے' اپنی حکمت عملی سے اور زبان کی جادوگری سے دلوں کو بھی جیت لیتا تھا۔

سکندر نڈھال سا ہو کر یوں بیٹھ گیا' جیسے باپ کے قدموں میں گر پڑا ہو۔

❁.........❁.........❁

فیلقوس اور پورا شاہی خاندان شادی کا جشن منا رہا تھا۔ اس کی بیٹی یعنی سکندر کی سوتیلی بہن کو دلہن بنایا گیا تھا۔ پورے محل میں رقص و موسیقی کی محفلیں گرم تھیں۔ جگہ جگہ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ ہر طرف قہقہے گونج رہے تھے۔ کبھی کبھی ایسے موقع پر کوئی ایسا المیہ پیش آ جاتا ہے' جس کی توقع پہلے کوئی نہیں کر پاتا۔

اور ایسے موقع پر کہا جاتا ہے' جہاں بجتی ہے شہنائی، وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں.....

اس خوشی کے موقع پر فیلقوس اپنی عادت کے مطابق خوب پی رہا تھا۔ اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ اطالوس بھی اس کے ساتھ بے ڈھنگے پن سے ناچ رہا تھا۔ فیلقوس نے اسے سمجھا دیا تھا' جیسے ہی سکندر کے آنے کی خبر ملے تو وہ وہاں سے چلا جائے۔ ایسی شادمانی میں وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔

لیکن سکندر اپنی آمد کی خبر کئے بغیر اچانک ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ اولمپیاس بھی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی فیلقوس چونک گیا۔ اطالوس کی سٹی گم ہو گئی۔ فیلقوس کے چونکنے کی وجہ اولمپیاس تھی۔ اس نے وہاں آ کر بادشاہِ وقت کی حکم عدولی کی تھی۔

یہ حکم تھا کہ وہ محل میں کبھی قدم نہ رکھے۔ موسیقی اور شور و غل تھم گیا تھا۔ سب ہی دم سادھے اولمپیاس اور فیلقوس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ شراب کے پیالے کو فرش پر پھینکتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''تُو نے یہاں قدم رکھنے کی جرات کیسے کی....؟''

پھر اس نے بیٹے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''تُو.....اور تُو.....میرے حکم کے خلاف اپنی ماں کو بھڑکا کر یہاں لایا ہے۔''

سکندر نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی ماں کو نہ لاتا مگر تُو نے مجھے بھڑکایا۔

اس روز تُو نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ اطالوس کو محل سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ لیکن آج جب معلوم ہوا کہ تُو خود اپنے حکم کے خلاف عمل کرتا ہے اور تھوک کر چاٹ لیتا ہے تو میں بھی اپنی ماں کو یہاں لے آیا ہوں۔ اپنے تمام درباریوں سے پوچھ لے میں نے کیا بُرا کیا ہے؟"

فیلقوس نے اپنی اکلوتی آنکھ سے تمام درباریوں کو دیکھا۔ سب ہی چپ کھڑے ہوئے تھے۔ نہ بادشاہِ وقت کے خلاف کچھ کہہ سکتے تھے' نہ ہی جنگجو شہزادے کو غلط کہہ سکتے تھے۔ اس نے وہی کیا تھا' جو باپ کر رہا تھا۔

فیلقوس غصے سے تلملا رہا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے سکندر سے پوچھا۔ "کیا میں جو کروں گا' وہی تُو بھی کرے گا؟"

"ہاں۔ میں تیرا بیٹا ہوں۔ باپ کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔"

فیلقوس نے پلٹ کر اطالوس کو ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ پھر کہا۔ "بدبخت! میں نے تجھے شادی پر بلایا اور تُو چلا آیا...؟ نکل جا یہاں سے...."

اولمپیاس فخر سے مسکرانے لگی۔ اس کے آتے ہی بازی پلٹ رہی تھی۔ فیلقوس نے پہلی بار اپنی محبوبہ کے چچا کو بھرے دربار میں طمانچہ مارا تھا۔ یوں اس چہیتی کے رشتہ دار سے عداوت شروع ہو چکی تھی۔ فیلقوس نے پلٹ کر سکندر سے کہا۔ "جو میں نے کیا' وہی تُو کر.... یہ عورت تیرے کہنے سے یہاں چلی آئی۔ اسے بھی طمانچہ مار اور محل سے نکال دے...."

وہ ایکدم سے بوکھلا کر بیٹے کو دیکھنے لگی۔ بیٹا چکرا کر رہ گیا تھا۔ باپ نے جو کیا' وہی وہ اپنی ماں کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے بولا۔ "تُو واقعی بادشاہ ہے۔ اپنی مخالفت کرنے والوں کو الجھانا اور گرانا جانتا ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میری ماں یہاں سے واپس جائے گی۔ لیکن میں اس سے کوئی گستاخی نہیں کروں گا۔ تُو مجھے معاف کر دے۔"

اس نے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جا میں نے معاف کیا۔ اس عورت کو



محل کے باہر چھوڑ آ"

سکندر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اطالوس وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ بھی باپ کے قدموں سے اٹھ کر ماں کے پاس آیا۔ پھر اسے محل سے باہر پہنچانے کی غرض سے جانے لگا۔ ایسے ہی وقت اس باپ کی کراہیں سنائی دیں۔

اس نے فوراً ہی پلٹ کر فیلقوس کو دیکھا تو ایکدم سے چونک گیا۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گرا ہوا تھا۔ کسی دشمن نے پیچھے سے آ کر اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ وہ آخری حملہ نہیں تھا۔ قاتل نے اچھل کر اس پر آتے ہوئے اسی خنجر سے دوبارہ حملہ کیا۔ اس وقت تک کتنے ہی سپاہی دوڑتے ہوئے چلے آئے تھے۔ سکندر بھی جیسے چھلانگیں لگاتا ہوا باپ تک پہنچا۔ پھر اسے اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے غم و غصے سے چیخنے لگا۔

قاتل کو پکڑ لیا گیا تھا۔ سب ہی اس کی پٹائی کر رہے تھے۔ اطالوس کہیں سے دوڑتا ہوا' چیختا چلاتا ہوا ہاتھ میں خنجر لہراتا ہوا آیا۔ پھر اس خنجر کو قاتل کے سینے میں گھونپ دیا۔ ادھر فیلقوس بیٹے کے بازوؤں میں دم توڑ رہا تھا۔ زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سکندر سر جھکا کر اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ وہ دھیمی لرزتی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔ "بادشاہت میں یہ بھی ہوتا ہے۔ موت کسی وقت بھی' کہیں سے بھی آ جاتی ہے۔ اے میرے ولی عہد! تُو ہوشیار رہنا...."

یہ کہتے ہی اس کی گردن ڈھلک گئی۔ قاتل کے مرتے ہی تمام افراد فیلقوس کے پاس آئے، وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس نے دمِ آخر بیٹے کو ولی عہد کہا تھا اور یہ بات حرف آخر تھی۔ مگر کسی نے نہیں سنی تھی۔ کوئی گواہ نہیں تھا کہ وہ بیٹے کو ولی عہد بنا کر گیا ہے۔

فیلقوس کا جسم اس آخری حملے سے پہلے بھی بار بار زخموں سے چُور ہوتا رہا تھا۔ مگر وہ بڑا جیدار تھا، زخم کھا کر جی اٹھتا تھا۔ اس بار مقدر نے اٹھنے نہ دیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی مقدونیہ کی اہمیت اور عظمت ڈھلتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ پوری سلطنت کو لگام دینے والا شہسوار تخت سے گر پڑا تھا۔ وہی مقدونوی قبائل کا دل و دماغ تھا۔ وہ صرف فوج کو ہی نہیں رعایا کو بھی منظم رکھتا تھا۔

اس ملک میں کوئی ایسی مجلس شوریٰ نہ تھی' جو اس کے ادھورے منصوبوں کو سنبھال کر تکمیل کی طرف لے جاتی۔ کوئی تجربہ کار وزیر بھی نہیں تھا اور اس نے اعلانیہ کسی کو اپنا جانشین بھی نامزد نہیں کیا تھا۔ دشمنوں کو بڑی کامیابی سے فریب دینے والا بادشاہ اپنوں کو فکرو پریشانی میں مبتلا کر گیا تھا۔

جان نشینی سے پہلے اس مسئلے کو بھی حل کرنا تھا کہ پاسنیاس نامی ایک شخص نے فیلقوس کو کیوں قتل کیا؟ اس قتل کے پیچھے کس کی سازش کارفرما رہی تھی؟ پہلا شبہ اولپیاس پر تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ بہت ضدی اور مغرور عورت ہے۔ اپنی شکست اور توہین کبھی برداشت نہیں کرتی۔ اسے نئی سوکن قلوپطرہ کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی۔ اسے محل سے نکال کر اس کی توہین کی گئی تھی۔ اسی لئے اس نے پاسنیاس کو آلۂ کار بنا کر بادشاہ کو قتل کرادیا تھا۔

دوسرا شبہ سکندر پر تھا۔ یہ دلیل پیش کی جارہی تھی کہ فیلقوس نے چند روز پہلے اپنے مشیروں اور مصاحبینِ خاص سے قلوپطرہ کو ملکہ بنانے کی بات کی تھی اور یہ بات سکندر تک پہنچ گئی تھی۔ سکندر نے یہ سوچا ہوگا کہ آج اسے ملکہ بنانے کا ارادہ کیا جارہا ہے' کل اس کے ہونے والے بیٹے کو ولی عہد بنادیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہی اس نے بے جا فیصلہ کرنے والے باپ کو مار ڈالا۔ مجلس شوریٰ بھی نہیں تھی۔ آئندہ وہ خود ساختہ بادشاہ بن سکتا تھا۔ کیونکہ سپہ سالار پارمینیو اور پوری فوج اس کے ساتھ تھی۔

تیسرا شبہ قلوپطرہ اور اس کے چچا اطالوس پر تھا۔ ان چچا بھتیجی نے اس قاتل پاسنیاس پر بہت ظلم وستم ڈھائے تھے۔ فیلقوس نے اس مظلوم کی فریاد نہیں سنی تھی۔ لہٰذا اس نے طیش میں آکر اسے مار ڈالا تھا۔ الزام یہ تھا کہ چچا بھتیجی کے ظلم کے باعث بادشاہِ وقت مارا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ظلم وستم کی فہرست طویل ہے۔

جتنے بھی الزامات تھے' وہ قیاس اور کمزور دلائل پر مبنی تھے۔ کسی کے خلاف کوئی ثبوت اور گواہ نہیں تھا۔ منظرِ عام پر جو قاتل تھا' اسے قتل کردیا گیا تھا۔ جانشینی کا معاملہ بھی متنازع تھا۔ یہ بات خاص و عام تک پہنچی ہوئی تھی کہ سکندر فیلقوس کا



نہیں' دیوتا زیوس کا بیٹا ہے۔ لہٰذا وہ تخت نشینی کا حقدار نہیں ہے۔

اس پہلو سے اعتراض ہونے لگا تو اولپیاس مشتعل ہو گئی۔ اس نے فیلقوس کو رقابت کی آگ میں جلانے کے لئے سکندر کو دیوتا زیوس کا بیٹا کہا تھا۔ اب یہ جھوٹ اس کے بیٹے کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ وہ دربار میں اور سلطنت کے مختلف حصّوں میں جا کر تقریریں کرنے لگی کہ یہ جھوٹ میری سوکنوں نے اور دشمنوں نے پھیلایا ہے۔ حقیقتاً دیوتاؤں کو نہ آج تک کسی نے دیکھا ہے' نہ وہ کسی مرد یا عورت کے پاس آتے ہیں۔"

وہ جہاں جاتی تھی۔ اسے دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے لئے دور دور سے لوگ چلے آتے تھے۔ وہ کہتی تھی۔ "اگر کسی نے کسی بھی دیوتا سے ملاقات کی ہے تو مجھے اس کا پتہ ٹھکانہ بتاؤ۔ میں بھی اس دیوتا کے درشن کروں گی اور جب یہ مانتے ہو کہ دیوتا کبھی ہم انسانوں کے رو برو نہیں آتے ہیں تو پھر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سکندر بے شک فیلقوس کا بیٹا ہے اور وہی تخت وتاج کا وارث ہے۔"

وہ بہت ہی ضدی' مغرور اور ظالم تھی مگر ایک ماں تھی۔ اس نے دن رات کی بھاگ دوڑ سے درباریوں کو اور عام لوگوں کو قائل کرلیا۔ سکندر کو تخت وتاج کا وارث ثابت کر دیا۔ اس کے سوتیلے بھائی بطلیموس نے اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر کہا۔ "تو نے میری بہت بڑی غلطی معاف کی تھی۔ ہمارے مقتول باپ کی طرح تو بھی اپنوں کی غلطیوں کو درگزر کرتا ہے اور ان کا صحیح مقام انہیں دیتا ہے۔ مجھ پر بھروسہ کر... آئندہ میں تیرا تابعدار بن کر رہوں گا۔"

سکندر نے کہا۔ "پہلے میں تجھے آزماؤں گا۔ آزمائش پر پورا نہ اُترا تو حرام موت مرے گا۔ اگر تُو نے وفا کی تو تجھے عزّت' دولت اور بلند مرتبہ حاصل ہوگا۔"

آرسی نوئی اور بطلیموس یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بادشاہِ وقت سے کسی بھی طرح کی عداوت رکھنا گویا اپنی کم بختی کو دعوت دینے والی بات ہوگی۔ فیلقوس کی ہلاکت کے نتیجے میں دو سوتیلے بھائیوں کی عداوت یکسر ختم ہوگئی تھی۔ سکندر نے بطلیموس کے

رویے سے مطمئن ہونے کے بعد اسے فوج کے ایک حصے کا سالار مقرر کر دیا۔

فیلقوس کے پرانے اور وفادار سالاروں میں سے ایک کا نام اینٹی گونس تھا۔ یہ بہت ہی سرکش اور حریص سالار تھا۔ معاملہ فہمی اور عسکری مہارت میں بڑی حد تک فیلقوس کی پرچھائیں ثابت ہوتا تھا۔ دوسرے سپہ سالار کا نام اینٹی پیٹر تھا۔ وہ احکامات کی تکمیل کے سوا کسی دوسرے امر سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ تیسرے سالار کا نام پارمینیو تھا۔ یہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث دونوں سپہ سالاروں کے درمیان اتصالی کڑی کا کام دیتا تھا۔

ایسے وفادار اور جنگجو سالاروں کی موجودگی میں بطلیموس کے لئے کوئی جگہ خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر سکندر نے اسے فوج کے ایک حصے کی کمان دے کر اس کا رُتبہ بڑھا دیا تھا۔

ایسے موقع پر اولمپیاس خاموش رہنے والی نہیں تھی۔ بیٹے کے فیصلے پر اعتراض کرتے ہوئے بولی۔ ''سوتیلے کو اتنا قریب نہ کر کہ وہ تیری جڑیں کاٹ ڈالے۔''

''میں نے بھرپور اطمینان کے بعد ہی اسے سپہ سالار منتخب کیا ہے۔''

''کیا اسے کسی نہ کسی کام سے لگانا ضروری تھا؟''

''کیا یہ بہتر ہوتا کہ اسے میری طرف سے پذیرائی نہ ملتی اور وہ پہلے کی طرح عداوت رکھتا؟''

''میں بس اتنا جانتی ہوں' جو ہتھیار تمہاری گردن کاٹ سکتا ہے۔ اسے مصرف میں لانے سے بہتر ہے کہ ایک طرف پھینک کر زنگ لگا دو۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''سانپ اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے۔ ڈسنے سے باز نہیں آتا۔ یہ سوتیلا بھی آستین کا سانپ ہے، اسے خود سے دور رکھنے کی کوشش کر...''

اس کی باتیں سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا توقف سے بولا۔ ''ابھی ایک فیصلہ کیا ہے۔ فوراً ہی دوسرا فیصلہ نہیں سنا سکتا۔ اس دوران دیکھتا ہوں' بطلیموس کیا رنگ



دکھاتا ہے؟''

باپ کی ہلاکت اور سلطنت کی ذمہ داریوں نے سکندر کو حد درجہ مصروف کر رکھا تھا۔ حکومتی امور کو سمجھنے اور اہم فیصلے کرنے کے فرائض ایسے تھے کہ سر کھجانے کی مہلت نہیں ملتی تھی۔ لیکن ان تمام تر مصروفیات کے باوجود مطالعہ کی عادت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ رات گئے حسب معمول کتابوں میں گم ہو جاتا تھا۔ اب تک خیالات کی دنیا میں زندگی گزارتا آیا تھا۔ جہاں افق کے پرے مختلف شہر آباد تھے۔ پہاڑوں کے اونچے سلسلوں میں مہربان دیوتا رہتے تھے۔ اس خیالی دنیا کی تلاش میں وہ اپنے اتالیق ارسطو کے نقش قدم پر چلتا رہا اور چاہتا تھا کہ انسانی ارتقاء کے مطالعے میں وہ منزلیں طے کر لے، جہاں پہلے کسی کے قدم نہ پہنچے ہوں۔

سکندر طبعاً شرمیلا تھا۔ کسی حد تک خیالات میں گم رہتا تھا۔ ایک بادشاہ کے لئے دوست اور دشمن کی پہچان ضروری ہوتی ہے۔ اقتدار کی شروعات میں وہ اس تفریق سے نابلد تھا۔ جو شخص بھی سامنے آ جاتا' اس پر بھروسہ کر لیتا۔ مشیروں اور وزیروں کے مشوروں پر عمل کرتا۔ دوسری طرف اولمپیاس بھی اپنے طور پر کوئی نہ کوئی رائے مشورہ دیتی رہتی تھی۔

سکندر اکثر محسوس کیا کرتا تھا کہ وہ دوسروں کی صلح لینے کے بعد الجھ سا جاتا ہے۔ لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عمر کی پختگی اور بتدریج تجربات نے سمجھایا کہ ایک حاکم وقت کو اپنے دماغ سے سوچنا' سمجھنا پھر ایک حتمی فیصلہ کرنا چاہئے۔

سکندر نے بیس سال کی عمر میں اپنی حقیقی زندگی کا سفر شروع کیا۔ ایک سال کے اندر ہی اندر اس کا مزاج یکسر بدل گیا۔ اب وہ کسی بھی مشورے کو اندھا دھند تسلیم نہ کرتا۔ خطرات کے ہجوم میں بڑی بے باکی سے گھس جاتا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے وطن سے نکل کر فوجوں کی قیادت کرتا ہوا ایشیا تک پہنچے گا۔

سکندر نے تخت و تاج سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے اطالوس کو دھکے مار کر محل سے نکال دیا تھا۔ فیلقوس کی موت کے بعد جب قلوپطرہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا تو وہ

سکندر کے پاس آکر بولی۔ ''تُو حاکمِ وقت ہے۔ میں اور میرا بیٹا تیرے سائے میں محفوظ ہیں۔ ہمیں یہاں کسی چیز کی تکلیف نہیں ہے۔ بس...''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ سکندر نے پوچھا۔ ''بس کیا...؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''سب ہی جانتے ہیں، تیرا ہر فیصلہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ تُو نے اطالوس کے سلسلے میں جو بھی فیصلہ کیا، میں اس کے خلاف کچھ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ ایک بار... صرف ایک بار مجھے میرے چچا سے ملادے۔ اس کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی سگا رشتہ نہیں ہے۔ میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ میں یہ خوشی اپنے چچا کے ساتھ بانٹنا چاہتی ہوں۔''

سکندر نے تیور بدل کر کہا۔ ''لیکن اس محل کا اور یہاں رہنے والوں کا اس بدبخت سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جب میں نے اسے دھتکار دیا تو سمجھ لے سب نے اس پر تھوک دیا ہے۔ تُو بھی یہ بھول جا کہ اس سے کوئی رشتہ رہا تھا۔''

وہ عاجزی سے بولی۔ ''زیوس کا واسطہ... ایسا ظلم نہ کر۔ لہو کے رشتے کبھی نہیں کٹتے۔ کبھی نہیں ٹوٹتے۔ وہ یہاں آئے گا، میرے بیٹے کو دیکھے گا اور چلا جائے گا۔ پھر تُو حکم دے گا تو میں زندگی بھر اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔''

وہ بولا۔ ''لیکن ابھی تو تُو نے کہا ہے، لہو کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے۔ پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ تُو اس ملاقات کے بعد پھر کبھی اس سے ملنے کی خواہش نہیں کرے گی؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''یہ سچ ہے، سگے رشتے ٹوٹ نہیں سکتے۔ البتہ جدا ہو جاتے ہیں۔ میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں، آئندہ اس کی جدائی برداشت کرتی رہوں گی۔''

سکندر گہری سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مخالفت کی ایک ننھی سی چنگاری بھی اس محل میں کہیں دبی رہ جائے۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس وقت قلوپطرہ کی فریاد قبول نہ کی گئی تو محل میں ایک نئی مخالفت پنپنے لگے گی۔ جبکہ سکندر کی رضامندی قلوپطرہ کو ہمیشہ کے لئے اس کا ممنون بنانے والی تھی۔

اس کی خاموشی سے وہ تڑپ گئی۔ روتے ہوئے التجا کرنے لگی۔ ''تُو حکم دے گا تو



میں دروازے سے ہی ملاقات کر کے اسے واپس بھیج دوں گی۔ وہ محل میں قدم نہیں رکھے گا۔ بس ایک بار....''

اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔ پھر کہا۔ ''یہ تم دونوں کی آخری ملاقات ہوگی۔ آئندہ کبھی ایسی خواہش کا اظہار کرے گی تو یاد رکھ... تجھے اطالوس سے ملوایا نہیں جائے گا۔ بلکہ تجھے تیرے بیٹے کے ساتھ اس کے پاس بھیج دیا جائے گا۔''

چنانچہ سکندر کے حکم کے مطابق ان چچا بھتیجی کو ایک دوسرے سے ملوا دیا گیا۔

اولمپیاس نے اعتراض کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ''تُو سوتیلوں پر اسی طرح مہربان ہوتا رہے گا تو یہ سر پر چڑھ کر ناچنے لگیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''میں ناچنے والوں کی ٹانگ کھینچنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ تُو فکر نہ کر...''

اولمپیاس محسوس کرنے لگی تھی کہ بیٹا اب بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں اس کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے بلکہ ایسے سنتا ہے، جیسے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا رہا ہو۔

فیلقوس کے بعد سب سے پہلے سرکش بربری قبائل کو اپنا باج گزار بنانا ضروری تھا۔ یہ قبیلے ہائی مس پہاڑ کی چوٹی کے آس پاس بلند وادیوں میں رہتے تھے اور موقع ملتے ہی میدانی علاقوں میں آکر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ ایسے بے لگام لٹیروں کو لگام دینا ضروری تھا۔ آنجہانی بادشاہ کے ادھورے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے سلسلے میں یہ پہلی اہم ذمہ داری تھی۔ لہٰذا سکندر نے پیلا کا انتظام اینٹی پیٹر کے حوالے کیا اور خود فوج کے ساتھ مہم پر جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

ایسے ہی وقت محل میں افراتفری پھیل گئی۔ قلوپطرہ اپنی خوابگاہ سے سینہ پیٹتی، روتی، چلاتی ہوئی باہر آتے ہوئے بولی۔ ''ہائے میرا بچہ.... میرا بچہ کہاں گیا...؟ ارے کوئی ہے.... میرا لعل....''

کتنی ہی کنیزیں اور دیگر ملازم دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ

روروکر بتارہی تھی کہ اس کا بچہ خوابگاہ سے کہیں غائب ہوگیا ہے۔اس کی بات سن کر سب ہی تشویش میں مبتلا ہوگئے۔اس شیر خوار کو تلاش کرنے لگے۔وہ ننھا منا سا بچہ خود چل کر کہیں نہیں جاسکتا تھا۔قلوپطرہ دہائیاں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔"ضرور کسی نے دشمنی کی ہے۔میرا کلیجہ نوچ لیا ہے۔ہائے میرا معصوم بچہ.....میں اسے کہاں تلاش کروں؟"

اس واقعہ نے سکندر کو بری طرح الجھا دیا تھا۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اس بچے کو کون اغوا کرسکتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہوا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس شاہی محل میں عداوتیں بدستور قائم ہیں۔ان لمحات میں سکندر کی یہ خوش فہمی ہوا ہوگئی تھی کہ وہ محل کو مخالفتوں اور عداوتوں سے پاک کرچکا ہے۔

ایک وزیر نے کہا۔"مجھے تو یہ اطالوس کا کام لگتا ہے۔"

سکندر نے گرج کر کہا۔"کیا شاہی محل کی دیواریں اتنی نیچی ہوگئی ہیں کہ اس جیسا زمین کا کیڑا رینگتا ہوا اندر آسکتا ہے؟ یا اسے پَر لگ گئے ہیں کہ وہ اڑ کر یہاں آیا اور کسی کو خبر نہ ہوسکی؟ اس پر شبہ کرنا سراسر نادانی ہے۔یہ ضرور کوئی گھر کا بھیدی ہے۔کوئی آستین کا سانپ ہے۔"

اس واقعہ نے تمام بیگمات کو مشتبہ بنا دیا تھا۔یہی سوچا جارہا تھا کہ ان میں سے کسی ایک سوکن نے ہی اس سوکن کے گھر میں آگ لگائی ہے۔محل کا کونہ کونہ کھنگالا جا رہا تھا۔سینکڑوں ملازم ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے اس بچے کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔صبح سے اب تک وہاں کا کوئی فرد محل سے باہر نہیں گیا تھا۔لہٰذا یہ بات تو طے تھی کہ بچے کو وہیں کہیں چھپایا گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی پائیں باغ سے ایک ملازمہ چیختی چلاتی ہوئی سکندر کے پاس آئی۔وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ہانپتے ہوئے' ہکلاتے ہوئے بولی۔"وہ.....وہ وہاں.....وہ ننھا شہزادہ وہاں.....جھاڑیوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

سکندر کے ساتھ محل کے تقریباً سب ہی افراد مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔دو ملازم جھاڑیوں کے پیچھے جاکر بچے کو اٹھا کر لے آئے تھے۔اس ننھے وجود میں زندگی کی



حرارت باقی نہیں رہی تھی۔قلوپطرہ مردہ بچے کو آغوش میں بھر کر دھاڑیں مارتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔محل کے طبیب کو بلا کر اس کا معائنہ کرایا گیا تو پتہ چلا اس معصوم کو گلا دبا کر ہلاک کیا گیا ہے۔

سکندر خاموش تھا۔گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ قلوپطرہ سے کون ایسی شدید دشمنی کرسکتا ہے؟ مہم پر جانے کی تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ لیکن سکندر کے حکم سے روانگی کو دو دنوں کے لئے ملتوی کردیا گیا تھا۔

اولمپیاس نے کہا۔"تیرے راستے کا ایک پتھر دور ہوگیا ہے۔ایک سوتیلا رشتہ ابدی نیند سوگیا ہے۔اب کوئی دعوے دار نہیں رہا۔تُو تنہا اس تخت وتاج کا وارث رہ گیا ہے۔تجھے تو جشن منانا چاہئے۔مگر میں دیکھ رہی ہوں' تُو اپنی تمام تر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اس کا سوگ منا رہا ہے۔"

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔"جشن بھی منا ہی لوں گا۔لیکن پہلے یہ تو پتہ چلے' مجھ پر اتنا بڑا احسان کرنے والا وہ محسن کون ہے؟"

اولمپیاس نے مسکرا کر کہا۔"میں نے کہا تھا نا' تجھ پر آسمانی طاقتوں کا سایہ ہے۔ دیوتا ازغیب سے تیری مدد کرتے ہیں۔"

وہ پلٹ کر جانے لگی۔پھر دروازے پر رک کر بولی۔"آم کھانے والے پیڑ نہیں گنا کرتے۔تجھے اپنی مہم پر توجہ دینی چاہئے۔"

وہ چلی گئی۔سکندر سوچتی ہوئی نظروں سے ادھر دیکھنے لگا۔ایسے وقت اس کے کانوں میں اولمپیاس کے فقرے گونج رہے تھے۔جب فیلقوس نے اسے محل سے نکال کر قلوپطرہ سے شادی کی تھی' تب اس نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔"میں اپنی توہین کبھی نہیں بھولوں گی۔اپنے انتقام کی آگ میں فیلقوس کو اس کی نئی بیوی سمیت جلا کر راکھ کرڈالوں گی۔"

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی وجہ سے اولمپیاس قلوپطرہ کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب نہ ہوسکی تو اس نے اس کے بچے کو ہلاک کرڈالا۔

ان حالات میں یہ سوال بھی ذہن میں کلبلانے لگا تھا' کیا فیلقوس کے قتل کے پیچھے بھی اولمپیاس کا ہاتھ ہے....؟

سکندر سوچتے سوچتے الجھ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ زیرِ لب کہنے لگا۔

''اگر ماں ایسا کر رہی ہے تو اس کی دشمنی کا اثر میری ذات پر بھی پڑے گا۔ اس نے اپنی سوکن کے بیٹے کو ہلاک کیا ہے۔ وہ سوکن بھی انتقاماً کوئی سازش کر سکتی ہے۔''

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ وہاں سگے سوتیلوں کے درمیان جو عداوتیں چلی آ رہی تھیں' وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں تھیں۔ فی الوقت سکندر کی سمجھ میں یہی بات آ رہی تھی کہ مقدونیہ کا دارالحکومت پیلا اور وہاں کا شاہی محل عداوتوں سے بھرپور ہے۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسے سازشی ماحول سے دور رہنے کی کوشش کرے گا۔

اینٹی پیٹر پیلا کی نیابت سنبھال رہا تھا۔ سکندر نے فوج کو دوسری صبح روانگی کا حکم دیتے ہوئے اپنے نائب سے کہا۔ ''مہم کے سلسلے میں مزید تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ میری غیر موجودگی میں حکومتی امور سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اس بچے کے قاتل کا سراغ لگانا بھی تیری ذمہ داری ہے۔ ہمارے درمیان پیغام رسانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مجھے پل پل کی خبر دیتے رہنا۔''

وہ اسے ضروری ہدایات دے کر دوسری صبح فوج کے ایک حصے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ فوج کا دوسرا حصہ پارمینو کی قیادت میں اگلے روز روانہ ہونے والا تھا۔ باپ کے بعد یہ اس کی پہلی مہم تھی۔ وہ بیوسی فالس پر سوار فوجی دستوں کے آگے آگے چل رہا تھا۔ دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ آئندہ کسی شدید مجبوری کے بغیر پیلا کے شاہی محل کا رخ نہیں کرے گا۔ مطالعے کی جس دنیا میں اس نے زندگی کے بیشتر اوقات گزارے تھے' وہ خیالی دنیا اس سے دور ہو گئی تھی۔ ایسے ہی موقع پر ارسطو نے کہا تھا۔ ''مقدونیہ کا طالب علم' اب تکمیل علم کی منزل میں داخل ہو گیا ہے۔''

===❁===



مقدونوی فوج ہائی مس کی بلند وادیوں میں پہنچ گئی تھی۔ سکندر کو اپنے فوجی افسروں کے ساتھ ایسے گھنے جنگلوں سے گزرنا پڑ رہا تھا' جہاں دشمن چھپ کر انہیں تیر کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ ایسے خطرناک سفر میں وہ فوج کی قیادت کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دشمن اس پر حملہ کرنا چاہے گا تو اس کا کوئی جاں نثار وقت سے پہلے اسے خبردار بھی نہیں کر سکے گا۔

ایک درّے کے قریب پہنچنے کے بعد انہوں نے پڑاؤ ڈالا۔ سپہ سالار اینٹی گونس نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کی خاموشی اور سناٹا دیکھ کر ایسا لگتا ہے' جیسے وہ قبیلے والے ہماری آمد کی خبر سن کر کہیں بھاگ گئے ہیں۔''

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ''دشمن بہت چالاک ہے۔ وہ خاموش رہ کر ہمیں ذہنی دباؤ میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔''

سکندر نے اپنے جاسوس سواروں کو آس پاس کا جائزہ لینے کے لئے بھیج دیا تھا۔ ایک سپاہی نے کہا۔ ''یہ خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ وہ لوگ وحشی جانوروں کی مانند بے رحم اور سنگدل ہیں، ضرور ہماری گھات میں کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ہی جاسوسوں نے آ کر یہ اطلاع دی کہ قبائلی دشمنوں نے بڑے بڑے چٹانی پتھروں کی ایک دیوار بنا رکھی ہے۔ وہ اس دیوار کی آڑ میں چھپ کر حملے

کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔سکندر نے کہا۔"تو پھر دیر کس بات کی....؟ہم بھی تیار ہیں۔"

ایک جاسوس نے کہا۔"وہ لوگ پہاڑ کی بلندی پر ہیں۔ہمارا فوجی دستہ پیش قدمی کرے گا تو وہ ان چٹانی پتھروں کو لڑھکا دیں گے، اس طرح ہمارے سپاہی ان پتھروں کی زد میں آکر مارے جائیں گے۔"

دوسرے سوار نے کہا۔"اور اگر منتشر ہو کر حملہ کیا جائے گا تو ہم دشمنوں پر قابو نہیں پا سکیں گے۔وہ ان چٹانی پتھروں کو لڑھکاتے ہوئے تتر بتر ہو جائیں گے۔چھپ کر حملے کریں گے۔اس صورت میں بھی ہمارا نقصان زیادہ ہوگا۔"

سکندر سوچ میں پڑ گیا۔سب ہی اپنے اپنے طور پر کوئی نہ کوئی مشورہ دے رہے تھے۔بالآخر فوج کے کمانڈار نے کہا۔"شاہِ مقدونیہ ہمارے ساتھ ہے۔یہ جو بھی حکم دے گا' ہمیں قبول ہوگا۔"

اس کی بات سن کر سب ہی اپنے آقا کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔سکندر نے دیکھا' سینکڑوں جانبازوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔وہ اس کے کسی بھی حکم کے منتظر تھے۔اس نے ذرا پہلو بدل کر دور اس راستے کو دیکھا' جہاں سے گزر کر وہ فوج اس درّے تک پہنچی تھی۔

ان لمحات میں تجربہ کار سپہ سالار پارمینیو کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اس کے انتظار میں وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔یوں بھی پارمینیو کا انتظار کرنا گویا اپنی ناقابلیت کا اعتراف کرنا تھا۔بظاہر وہ مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔مگر اندر ہی اندر تذبذب میں مبتلا تھا۔

فوری طور پر اس مشکل کا جو حل سمجھ میں آیا۔اس نے اسی کے مطابق حکم دیتے ہوئے کہا۔"تم پیش قدمی کرو۔اگر دشمن پتھر لڑھکائے تو فوراً منتشر ہو جانا۔اس طرح وہ پتھر تمہارے آس پاس سے لڑھکتے ہوئے نیچے چلے آئیں گے۔ایسے وقت اپنے حواسوں پر قابو پانا ضروری ہوگا۔بدحواس ہو کر بھاگو گے تو بے موت مارے جاؤ گے۔"

یہ حکم ملتے ہی فوج نے پیش قدمی شروع کر دی۔وہ مقدونوی فوج فیلقوس کی



قیادت میں جنگی تجربات حاصل کرتی رہی تھی۔یوں کہنا چاہئے کہ فیلقوس نے انہیں خطرات کا عادی بنا دیا تھا۔وہ جانباز سپاہی کسی حیل و حجت کے بغیر ہر اس حکم کی تعمیل کرتے تھے' جو حالات کے مطابق اچانک ہی صادر کئے جاتے تھے۔

سکندر کی حاضر دماغی نے بڑی حد تک تمام ممکنات کا جائزہ لے لیا تھا۔لہٰذا فوج بڑے استقلال کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔پہاڑ کے اوپری حصے پر چھپے ہوئے دشمنوں نے جب مخالف فوج کی پیش قدمی دیکھی تو انہوں نے فوراً ہی پتھروں کو لڑھکانا شروع کر دیا۔

پہاڑ کی بلندی سے چھوٹے بڑے پتھروں کا ریلا آ رہا تھا۔فوج کی صف بندی ٹوٹ گئی۔سپاہی اس پتھریلی افتاد سے بچنے کے لئے فوراً ہی منتشر ہو کر جیسے بازی گری کے کرتب دکھانے لگے۔لڑھکتے ہوئے پتھروں کے قریب آنے سے پہلے ہی کبھی چھلانگیں لگا کر' کبھی قلابازیاں کھا کر پیش آنے والی موت سے کترانے لگے۔ایسی حکمت عملی کے باوجود کئی سپاہی پتھروں کے نیچے آ کر کچلے جا رہے تھے۔سکندر بیوسی فالس پر سوار تھا۔دور سے فوج کو آگے بڑھتے اور اپنے جاں نثاروں کو جانی و مالی نقصان اٹھاتے دیکھ رہا تھا۔

دشمنوں نے پتھروں کا جو ذخیرہ کیا تھا' وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔فوج پہلے کی طرح الگ الگ دستوں میں منظم ہو گئی۔پورے جوش و خروش سے آگے بڑھنے لگی۔بربری قبائل کے لوگ مقدونوی فوج کے ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔جب انہوں نے دیکھا کہ سپاہی چٹانی پتھروں کی آفت سے بچنے کے بعد بڑے استقلال سے پیش قدمی کر رہے ہیں تو وہ سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے اور آس پاس کے جنگلوں میں جا کر چھپ گئے۔جو سپاہیوں کے ہتھے چڑھے انہیں گرفتار کر کے سکندر کے سامنے پیش کیا گیا۔اس نے کہا۔"میرا مقصد تمہیں قیدی بنانا یا سزائیں دینا نہیں ہے۔تم میری سلطنت کا حصہ ہو۔میری رعایا ہو۔اگر تم لوگ میدانی علاقوں میں جا کر لوٹ مار کرنے سے باز نہ آئے تو عظیم دیوتاؤں کی قسم! میں تمہارا جینا حرام کر دوں گا۔"

ایک بربری نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا۔ ”ہمارا سردار جو حکم دیتا ہے، ہمیں اسی کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔“

سکندر نے ان میں سے ایک شخص کو قاصد بنا کر قبیلے کے سردار کی طرف روانہ کیا اور یہ پیغام بھیجا۔ ”تیرے پاس نہ طاقت ہے، نہ ہتھیار ہیں۔ چٹانی پتھروں سے ہمیں نقصان پہنچانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ تُو مقدونوی فوج کا استقلال دیکھ چکا ہے۔ ہمارے سپاہی تجھے اور تیرے قبیلے والوں کو قیدی بنانے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ اگر آزادی سے جینا چاہتا ہے تو میری سرکشی سے باز آجا۔“

سردار نے سکندر کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس کی یہ پہلی مہم تھی، جس میں کسی مقابلے اور خون خرابے کے بغیر زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ آس پاس کے تقریباً تمام قبائل اس کے باج گزار بن گئے تھے۔

اس کامیابی کے بعد فوج نے آگے کُوچ کیا۔ منزل کا تعین نہیں تھا۔ وہ قبائلی علاقوں سے گزرتے ہوئے دو دنوں تک مسلسل سفر کرنے کے بعد ڈینیوب کے ساحل پر پہنچ گئے۔ ستاروں کی روشنی میں دریا کی لہریں چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اینٹی گونس نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”دریا کے اس پار ضرور کوئی شہر آباد ہوگا۔ لیکن رات کی تاریکی اور شبنمی دھند میں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

سکندر نے تائید میں سر ہلا کر دور تک نظریں دوڑائیں۔ اسے بھی دریا کے آس پاس زرخیز علاقوں میں آبادی کا یقین تھا۔ سپاہیوں نے اس کے حکم سے پیش قدمی کی۔ وہاں چھوٹی بڑی کشتیاں لنگر انداز دکھائی دیں۔ ایک طرف بنی ہوئی جھگیاں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ ان کشتیوں کے رکھوالے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

سپاہیوں نے اچانک ہی انہیں چاروں طرف سے گھیر کر قیدی بنا لیا۔ وہ کشتی بان سلٹ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ذریعہ یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ دریا کے اس پار سلٹ قبیلے کا ایک شہر آباد ہے۔ سکندر نے ہفااشن سے کہا۔ ”ہمیں رات کی



تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شہر کو محاصرے میں لینا چاہئے۔“

چنانچہ اس کے حکم کے مطابق عمل کیا گیا۔ راتوں رات وہ فوج اپنے مال و اسباب کے ساتھ دریا عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ ستاروں کی روشنی میں دور دور تک گندم کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کشتی بانوں کی رہنمائی میں ان کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جاڑے کی رات تھی۔ سیلن زدہ زمین اور شبنمی دھند کے باعث ایک ایک سپاہی کانپ رہا تھا۔

صبح کی پو پھٹنے سے پہلے وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے۔ اس شہر کی محافظ دیواریں لکڑی کی تھیں۔ رات کے اس پہر پورا شہر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس بات سے بے خبر تھا کہ دشمن ناگہانی آفت کی طرح ان پر دھاوا بولنے والے ہیں۔ مقدونوی فوج نے شہر کو چاروں طرف سے محاصرے میں لے لیا تھا۔ لیکن سکندر کے حکم کے مطابق ابھی پیش قدمی نہیں ہو رہی تھی۔ اینٹی گونس نے دبی زبان میں کہا۔ ”شہری ہماری آمد سے بے خبر ہیں۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ فوج کو پہریداروں کی طرح روک کر رکھنا سراسر نادانی ہے۔“

سکندر نے کہا۔ ”جنہیں اپنی طاقت پر بھروسہ نہ ہو، وہ نقب زنی کرتے ہیں۔ بے شک۔ دشمن کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہئے مگر پہلے یہ تو دیکھ کہ وہ مخالف کتنا زور آور ہے؟ کیا یہ لکڑی کی دیواریں سلٹ قبیلے کی کمزوری کا پتہ نہیں دے رہی ہیں؟“

اینٹی گونس نے سر جھکا لیا۔ سکندر نے کہا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، کیا ایسے کمزوروں پر بھی مقدونوی فوج کو پیچھے سے حملہ آور ہونا چاہئے؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور سر جھکائے کھڑا رہا۔ سکندر نے کہا۔ ”جہاں سہولت سے معاملہ نمٹنے والا ہو، وہاں خون خرابہ ضروری نہیں ہوتا۔“

طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ شہریوں کی آنکھیں کھلیں تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے گرد مسلح فوج کھڑی ہے۔ وہ اپنے ہی شہر میں محصور ہو گئے ہیں۔ فوراً ہی

قبیلے کے سردار کو خبر دی گئی کہ مقدونوی فوج نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے ۔ان کے ساتھ مقدونیہ کا بادشاہ سکندر بھی وہاں پہنچا ہوا ہے۔ وہ اس کا نام سن کر اچھل پڑا۔ ''سکندر...؟ وہی دیوتا زیوس کا بیٹا...؟''

مخبر نے تائید میں سر ہلایا۔ سردار نے فوراً ہی اپنی بیویوں کے ہیرے جواہرات اور سونے کے زیورات جمع کئے۔ پھر انہیں بڑے بڑے تھالوں میں سجا کر سکندر کی طرف جانے لگا۔ وہ بیوسی فالس پر بیٹھا سلٹ قبیلے کے سردار اور اس کے نائب کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے چمڑے کی برجسیں پہن رکھی تھیں۔ سلٹ سردار اس کے روبرو حاضر ہو کر تعظیماً جھک گیا۔ سکندر نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

سردار نے کہا۔ ''یہ شاہِ مقدونیہ کا خراج ہے۔''

''حیرت ہے۔ حملہ کرنے والی فوج کو خراج پیش کیا جا رہا ہے؟''

''کیونکہ ہم تیری دشمنی مول لینا نہیں چاہتے، اس لئے مقابلے سے پہلے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔''

سکندر نے خوش ہو کر ہفاسشن اور اینٹی گونس کو دیکھا۔ پھر سردار سے کہا۔

''تُو اپنے لب و لہجے سے بہادر معلوم ہوتا ہے۔ پھر ایسی بزدلی کیوں دکھا رہا ہے؟''

''دشمن کتنا ہی شہزور کیوں نہ ہو۔ میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔''

''پھر میرے سامنے کیوں جھک رہا ہے؟''

''کیونکہ میں دیوتاؤں سے سرکشی نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کیا تو یہ آسمان ہم پر آ گرے گا۔ سب ہی جانتے اور مانتے ہیں کہ تُو عظیم دیوتا زیوس کا بیٹا ہے۔ اس لئے تیری تعظیم لازمی ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، بس مسکرا کر رہ گیا۔ دل ہی دل میں یہ تسلیم کرنے لگا کہ اس کامیابی کا سہرا اولمپیاس کے سر جاتا ہے۔

دو روز بعد پارمینیو بھی اپنے دستے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ سکندر اس مہم کے بعد



فوج کو آگے کوچ کرنے کا حکم دینا چاہتا تھا۔ ایسے وقت پارمینیو نے کہا۔ ''ہمارے سپاہی تنخواہ دار نہیں ہیں۔ کسی بھی مہم سے نمٹنے کے بعد یہ سب اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ وہاں اپنے کنبے کی کفالت کے لئے کھیتی باڑی اور دوسرے کام کاج میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پھر جب فوج کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو یہ موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔''

''تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟ کیا میں اپنا سفر روک دوں؟ واپس پلٹ جاؤں؟''

وہ بولا۔ ''ایسا ہی کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے سپاہی طویل مدت تک اپنے گھروں سے دور نہیں رہ سکتے۔ اس طرح ان کے خاندان والے معاشی مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔''

سکندر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ''مجھے بہت آگے جانا ہے۔ اس زمین کے کنارے کو چھونا ہے اور اس کے لئے فوجی طاقت بہت ضروری ہے۔ اگر سپاہیوں کے لئے مستقل تنخواہیں مقرر کر دی جائیں تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

پارمینیو نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس حل کے لئے پیلا جانا ضروری ہے۔''

سکندر واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن آگے قدم بڑھانے کے لئے پلٹنا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے فوج کے ساتھ واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اسی دوران اینٹی پیٹر کے قاصد نے آ کر یہ خبر سنائی کہ محل میں قلوپطرہ کو بڑے ہی پراسرار طریقے سے قتل کر دیا گیا ہے۔

سکندر یہ خبر سن کر چونک گیا۔ اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ ان ماں بیٹے کے قتل کے پیچھے اولمپیاس کا ہاتھ ہے۔ بے شک وہ بیٹے کے راستے کے پتھر صاف کر رہی تھی مگر اس کی ایسی کارروائیاں سکندر کو بدنام کر رہی تھیں۔ اطالوس کو تو جیسے کھلی مخالفت کا موقع مل گیا تھا۔ وہ لوگوں کو بھڑکاتا پھر رہا تھا' مظلوم بن کر فریاد کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ پہلے اسے شاہی محل سے بے دخل کیا گیا پھر اس کی بھتیجی اور

اس کے شیر خوار بچے کو قتل کر دیا گیا۔ سکندر اور اولمپیاس کے خلاف مقدمہ چلنا چاہئے۔ وہ قلوپطرہ اور اس کے بچے کے قاتل ہیں۔

اس کے کئی حمایتی بھی پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اولمپیاس اور شاہ مقدونیہ کے خلاف نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ اطالوس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ آنجہانی فیلقوس کے قتل کے پیچھے بھی ان ماں بیٹے کا ہاتھ ہے۔ سکندر اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار کر خود تخت پر راج کر رہا ہے اور آئندہ بھی تنہا حکومت کرتے رہنے کے لئے تمام سوتیلوں کو ایک ایک کر کے ہلاک کرتا جا رہا ہے۔

اینٹی پیٹر نے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''اطالوس بکواس کرتا ہے۔ سکندر پر بے بنیاد الزام لگا رہا ہے۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔''

اطالوس نے کہا۔ ''اگر اس نے نہیں کیا ہے تو اس کی زہریلی ماں نے ایسا کیا ہے۔ اس کا یہ عالیشان محل سازشوں کا گہوارہ بن گیا ہے۔ سکندر نااہل ہے۔ جو بادشاہ اپنے گھر میں امن وامان پیدا نہ کر سکے' بھلا وہ سلطنت کے امور سے کیسے عہدہ برآء ہو سکے گا؟''

اِدھر اینٹی پیٹر اطالوس سے نمٹ رہا تھا۔ اُدھر سکندر پیلا پہنچ گیا۔ اولمپیاس بیٹے کی آمد پر خوشیاں منانا چاہتی تھی۔ اس کی کامیابیوں پر جشن کا اہتمام کرنا چاہتی تھی۔ سکندر نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کوئی خوشی نہیں منائی جائے گی۔ میری سلطنت کے لوگ میرے مخالف ہو رہے ہیں۔ یہ جشن کا نہیں' ماتم کا مقام ہے۔''

وہ بولی۔ ''وہ سب اطالوس کے چیلے ہیں۔ شیطان مرے گا تو اس کے چیلے خود بہ خود ختم ہو جائیں گے۔''

''وہ تو میرا مخالف تھا ہی، لیکن تیرے ذریعہ اس محل میں ہونے والی سازشوں کو اس کی مخالفت نے ہوا دی ہے۔''

وہ شانے اچکا کر بولی۔ ''جہاں سیاست ہو' اقتدار ہو' وہاں سازشیں تو ہوتی ہی ہیں۔''



''تُو نے قلوپطرہ اور اس کے بیٹے کو ہلاک کر کے اچھا نہیں کیا۔''

وہ تیز نظروں سے بیٹے کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''کیا تُو مجھے قاتل سمجھ رہا ہے؟''

''سمجھ نہیں رہا ہوں۔ یقین سے کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ ایسا انتہائی قدم تیرے علاوہ اور کوئی نہیں اٹھا سکتا۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اگر ایسا ہی ہے تو کیا تُو مجھے سزا دے گا؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا ہر قدم تیری بہتری کے لئے اٹھتا ہے۔ میں نے جو کیا اور آئندہ جو بھی کرنے والی ہوں' اس میں تیری بھلائی ہے۔''

''میں تجھے سزا تو نہیں دے سکتا لیکن ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ تُو میری فکر کرنا چھوڑ دے۔ تیری غلط حکمت عملی نے اطالوس جیسے کیچوے کو زہریلا سانپ بنا دیا ہے۔ وہ ہم دونوں کے خلاف زہر اگلتا پھر رہا ہے۔''

''میں ایسے سانپوں کا سر کچلنا اچھی طرح جانتی ہوں۔''

سکندر نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''تُو ایسا کچھ نہیں کرے گی۔ اگر اطالوس مارا گیا تو ہم پر جو الزامات لگائے گئے ہیں' انہیں درست تسلیم کیا جانے لگے گا۔ اس دشمن سے کیسے نمٹنا ہے' یہ فیصلہ میں خود کروں گا۔''

وہ ماں کو تاکید کر کے وہاں سے چلا گیا۔ اولمپیاس نے کوئی بحث نہیں کی۔ بڑی خاموشی سے مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر زیر لب بولی۔ ''اولمپیاس کو اس کے ارادوں سے باز رکھنا بہت مشکل ہے میرے بیٹے...! تُو اطالوس کے سلسلے میں جو بھی فیصلہ کرے گا' مجھے منظور ہو گا۔ بشرطیکہ وہ تیرے فیصلے تک زندہ رہے....''

دوسرے روز شام سے پہلے پہلے سکندر کو یہ اطلاع مل گئی کہ اطالوس کو اس کے ایک حمایتی نے زہریلے تیر کے ذریعہ ہلاک کر دیا ہے۔ ایسے وقت اولمپیاس بیٹے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ ''یہ اچھا ہی ہوا۔ شیطان اپنے چیلے کے ہاتھوں

ہلاک ہو گیا۔ خس کم، جہاں پاک....''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ اس بار اس مکار عورت نے ایسی چال چلی تھی کہ سانپ بھی مر گیا تھا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ اطالوس کو اس کے حمایتی کے ہاتھوں قتل کرایا گیا تھا۔ لہٰذا سکندر پر کوئی الزام آنے والا نہیں تھا۔ اولیپیاس نے بیٹے کے فیصلے سے پہلے ہی اس دشمن کو جہنم رسید کر ڈالا تھا۔

اطالوس کی موت کے ساتھ ہی تمام مخالفتیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔ پھر سکندر کی حکمت عملیوں نے اور سلطنت کے انتظامات میں خوش آئند تبدیلیوں نے رعایا کو یہ سمجھا دیا کہ وہی ان کا بہترین آقا ثابت ہو رہا ہے۔

اس نے فوج کے تمام سپاہیوں کے لئے تنخواہیں مقرر کر دی تھیں۔ اس فیصلے کے مثبت نتائج حاصل ہو رہے تھے۔ تنخواہ کے لالچ میں بھرتی ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بے روزگار پھرنے والے نوجوان بھی شاہی فوج کا رخ کر رہے تھے۔ اس طرح سکندر کی فوجی طاقت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

تب اس نے دوبارہ مہم جوئی کا فیصلہ کیا اور سلطنت کا نظام اینٹی پیٹر کے حوالے کر کے پیلا سے رخصت ہو گیا۔ سکندر کی فتوحات کی فہرست بہت طویل ہے۔ لہٰذا ان واقعات کو کسی حد تک اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

وہ سکندر اعظم مقدونیہ کے دور و نزدیک کی چھوٹی بڑی ریاستوں اور سلطنتوں پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا سخت مشکلات اور جان لیوا خطرات سے گزرتا ہوا کائی رونیا پہنچ گیا۔ مقدونوی فوج کے ساتھ یونانی کمک بھی شریکِ سفر تھی۔ سکندر نے کائی رونیا میں پیش قدمی کرنے سے پہلے ایشیائے کوچک کے قریب پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا تاکہ جتنے علاقے فتح کئے جا چکے تھے، ان کے حکومتی انتظامات درست کر لئے جائیں۔

مسلسل جنگجوئی اور سفر کی تھکان نے سب ہی کو نڈھال کر دیا تھا۔ پڑاؤ کے دوران ہتھیاروں کو صاف کرنے اور نئی مہم کے لئے تازہ دم ہونے کا موقع مل رہا



تھا۔ فوج کے جیالے سرِ شام ہی سو جاتے تھے۔

سکندر دیر تک جاگنے اور مطالعہ میں غرق رہنے کا عادی تھا۔ طویل عسکری سفر کے بعد ذرا سکون حاصل ہوا تو اسے اپنی ان کتابوں اور قدیم نوشتوں کی یاد ستانے لگی، جنہیں وہ اپنی مطالعہ گاہ میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ رات گئے تک کروٹیں بدلتا رہتا۔ کسی طور چین نہ آتا تو اکثر اپنے خیمے سے باہر آ کر لہروں کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرنے لگتا۔ اس رات وہ باہر آیا تو دور چٹانی پتھر پر ایک سپاہی کو دیکھ کر چونک گیا، وہ دودھیا چاندنی میں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

سکندر دھیرے دھیرے چلتا ہوا پتھر کے قریب آیا تو پتہ چلا، وہ سپاہی یوری پائیڈیز کا ایک افسردہ گیت گنگنا رہا ہے۔ سکندر نے اسے پکارا۔ ''اے جوان..! اتنی رات گئے تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

سکندر کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ فوراً ہی چٹانی پتھر سے اتر کر اس کے سامنے آ کر جھکتے ہوئے بولا۔ ''شاہِ مقدونیہ پر عظیم دیوتاؤں کا سایہ رہے....''

''تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''وہ... نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''نیند نہیں آتی تو کسی کی یاد آتی ہے۔ تُو یہاں بیٹھ کر کسے یاد کر رہا ہے؟''

اس کے چہرے پر اداسی کے سائے لہرا رہے تھے۔ اس نے بڑی افسردگی سے کہا۔ ''یہاں سب ہی اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ کر آئے ہیں۔ ہر کسی کو کچھ نہ کچھ یاد آتا ہی رہتا ہے۔''

وہ دور تک پھیلے ہوئے سمندر پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ مجھے بھی اپنی کتابیں یاد آتی ہیں۔''

ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ دونوں ہی چہل قدمی کرنے لگے۔ سکندر نے پوچھا۔ ''تُو نے بتایا نہیں، یوری پائیڈیز کا وہ افسردہ گیت کس کے لئے گنگنا رہا تھا؟''

وہ بولا۔ ''میں اپنے پیچھے بوڑھے ماں باپ کو اور اپنی نوبیاہتا دلہن کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ جس روز مہم کے لئے روانہ ہوا تھا' وہ ہماری شادی کی پہلی صبح تھی۔''

سکندر کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔ ان لمحات میں ایسا لگ رہا تھا' جیسے اس نے انجانے میں اس نوجوان پر بہت بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ ایک وہی نہیں' فوج میں اور نہ جانے کتنے ایسے شادی شدہ سپاہی تھے' جو اپنے بیوی بچوں سے دور ہو گئے تھے اور سکندر کے ساتھ پچھلے کئی مہینوں سے مسلسل جنگجوئی میں مصروف تھے۔

اس نے دوسری ہی صبح شادی شدہ فوجیوں کو رخصت پر وطن جانے کی اجازت دے دی۔ سب ہی نے اس رعایت کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ انہیں رخصت کرتے ہوئے یہ تاکید کی گئی کہ وطن سے واپسی پر مقدونیہ اور یونان سے جتنے بھی رنگروٹ مل سکیں' انہیں وہ آئندہ موسم بہار میں اپنے ساتھ لے کر واپس آئیں تاکہ فوج میں سپاہیوں کا اضافہ ہو جائے۔

ان فوجیوں کو ایک سالار کی قیادت میں رخصت کرنے کے بعد سکندر نے اپنے لشکر کے ساتھ کائی رونیا کا رخ کیا۔ مقدونوی فوج سطح مرتفع کے اونچے نیچے اور پُرخطر سلسلوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ پُرہیبت پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ اُن پہاڑی سلسلوں کے دامن میں قبائلی لوگ آباد تھے۔

انہوں نے ایک منظم فوج کو موسم سرما میں بلندیوں پر چڑھتے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ اہل مقدونیہ خود پہاڑی باشندے تھے۔ پہاڑوں پر راستے بناتے رہنا ان کے لئے مشکل نہ تھا۔ لیکن برفانی چوٹیوں سے چلنے والی یخ بستہ ہوائیں رگوں میں خون منجمد کر رہی تھیں۔ پڑاؤ کے دوران آگ جلانے کے لئے سوکھی لکڑیاں بھی بہت مشکل سے حاصل ہو رہی تھیں۔ ایسے میں وہ ایک دو نہیں' بلکہ فوج کی فوج سرد موت سے لڑنے آئی تھی۔

سکندر کے ایک کماندار نے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں موسم سرما کے



بعد پیش قدمی کرنی چاہئے تھی۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''یہی میری حکمت عملی ہے۔ موسم سرما میں پہاڑی باشندوں کو مسخر کرنا آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ برفباری کے باعث وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چوٹیوں کا رخ نہیں کر سکتے۔''

پڑاؤ کے دوران ایک گردسوار نے آ کر یہ اطلاع دی کہ اس علاقے کے تمام افراد مقدونوی فوج کی آمد سے خوفزدہ ہو کر اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک ایسی چٹان پر جا بیٹھے ہیں' جسے مسخر کرنا آسان نہیں ہے۔

تجربہ کار مقدونیوں نے فوراً ہی اس چٹان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر قاصدوں کے ذریعہ دونوں طرف سے پیغامات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ سکندر نے قبیلے کے سردار کے نام یہ پیغام بھیجا۔ ''ہم لڑائی جھگڑا اور خون خرابہ نہیں چاہتے۔ تُو دیکھ ہی رہا ہے' مقدونوی فوج طاقت میں تجھ سے برتر ہے۔ مقابلہ کرنا چاہے گا تو حرام موت مارا جائے گا۔ لہٰذا نیچے آ اور ہم سے معاہدہ کر لے۔''

قبیلے کے سردار نے جواباً پیغام بھجوایا۔ ''میں فی الحال مجبور ہوں مگر کمزور نہیں ہوں۔ دو دن بعد میرے پاس کمک پہنچنے والی ہے۔ اس کے بعد ہماری طاقت تیری مسلح فوج کے برابر ہو جائے گی۔''

سکندر اس پیغام پر مسکرانے لگا۔ ''احمق نہ بن... میں اچھی طرح جانتا ہوں' تُو نے ایسی افراتفری میں اس چٹان پر پناہ لی ہے کہ تیرے اور تیرے قبیلے والوں کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا دوسرا کوئی سامان نہیں ہے۔ کیا تُو دو دنوں تک بھوکا پیاسا اس چٹان پر بیٹھا رہنا چاہتا ہے؟ وہاں عورتیں ہیں' بچے ہیں' بوڑھے اور بیمار افراد بھی ضرور ہوں گے۔ ایسی بے سروسامانی کی حالت میں یہ سخت موسم ان پر عذاب بن کر ٹوٹے گا۔ اوپر قبیلے والے ہلاک ہوتے رہیں گے اور یہاں نیچے ان کے مویشی سردی سے ٹھٹھر کر مرتے رہیں گے۔ ایسے جانی اور مالی نقصان سے بہتر ہے' مجھ سے معاہدہ کر لے اور میرا باج گزار بن جا...''

''میں ایک حاکم کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔غلامی مجھے پسند نہیں...''

''باج گزار بننے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تُو میرا زرخرید غلام بن کر رہ جائے گا۔یہاں تیرا اقتدار قائم رہے گا۔فرق ہوگا تو صرف اتنا کہ سطح مرتفع کے اس علاقے کو مقدونوی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد تیری ڈور میرے ہاتھوں میں رہے گی۔''

سکندر کی پیشکش پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔اس کے ایک دستِ راست نے کہا۔''وہ مقدونوی بادشاہ درست کہہ رہا ہے۔تجھے صلح جوئی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔اس سے معاہدہ کرلے۔اس طرح ہم جانی اور مالی نقصان سے محفوظ رہیں گے اور یہاں کی حکومت بھی تیرے ہاتھوں میں رہے گی۔''

سردار نے کہا۔''پھر بھی میں کمک کا انتظار کروں گا۔یہ بھی ممکن ہے' وہ مقدونوی دشمن حکومت کا لالچ دے کر مجھے دھوکا دینا چاہتا ہو۔ہمیں پوری تیاری کے ساتھ چٹان سے نیچے اترنا ہوگا۔''

پھر اس نے سکندر کو یہی پیغام بھیجا کہ فی الحال وہ وہاں پہنچنے والی کمک کا انتظار کر رہا ہے۔اس کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کر سکے گا۔سکندر نے پوچھا۔''اور اگر کمک نہ پہنچی تو...؟''

''تو یہ سردار تیرا باج گزار بن جائے گا۔''

سکندر مفاہمت کے راستے نکالنا خوب جانتا تھا۔یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ کمک پہنچنے کے باوجود پسپائی اس قبیلے کا مقدر بنے گی مگر دو روز بعد ہونے والی اس جنگ میں مقدونوی فوج کو بھی جانی نقصان پہنچے گا لہٰذا ایسے نقصان سے بچنے کے لئے اس نے ایک زبردست تدبیر اختیار کی۔

دن بھر کا تھکا ہارا سورج برفانی چوٹیوں کے پیچھے منہ چھپا رہا تھا۔شام کے سائے گہرے ہونے کو تھے۔ایسے وقت قبیلے کے سردار اور اس کے حواریوں نے دیکھا کہ مقدونوی فوج کے کئی سپاہی چٹان کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ان کے ساتھ مال بردار خچر بھی تھے۔سردار فوراً ہی آگے بڑھ کر چلایا۔''میں اسے مقدونیوں کی دھوکا



دہی سمجھوں یا وعدہ خلافی...؟''

سکندر کے قاصد نے قریب آتے ہوئے کہا۔''تُو دیکھ سکتا ہے' ہم نہتے ہیں۔ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔''

سردار نے خچروں پر لدے ہوئے سامان کو تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔''تو پھر یہ سب کیا ہے؟ ان خچروں پر کیا لدا ہوا ہے؟''

وہ بولا۔''شاہ مقدونیہ نے تم لوگوں کے لئے خوراک اور گرم بستر بھجوائے ہیں۔''

خوراک کا سنتے ہی پورے دن کے بھوکے پناہ گزینوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بوڑھے اور بیمار افراد حسرت بھری نگاہوں سے گرم بستروں کو دیکھنے لگے۔سردار نے ذرا تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔''وہ ایسی ہمدردی کیوں کر رہا ہے؟''

''کیونکہ تُو نادانی کر رہا ہے۔میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دینا شہزوروں کا وطیرہ ہوتا ہے۔مگر تُو مقابلے سے پہلے اپنے قبیلے کے کمزور لوگوں کی جان لینا چاہتا ہے۔''

مقدونوی سپاہی وہ امدادی سامان اس چٹان پر چھوڑ کر نیچے اتر آئے۔رات گزر گئی۔دوسرا دن بھی گزرنے لگا۔تب سکندر نے ان لوگوں کے پاس دوبارہ خوراک بھجوائی۔اینٹی گونس نے ناگواری سے کہا۔''یہ سردار بہت ہی ڈھیٹ ہے۔اس دشمن پر حملہ کرنے کے لئے ہمیں کوئی راہ نکالنی چاہئے۔''

سکندر نے کہا۔''وہ ہمارا دشمن نہیں ہے۔صرف مخالف ہے....اور کسی بھی مخالف کو اپنا حمایتی بنانے کے لئے جبر سے نہیں' صبر سے کام لیا جاتا ہے۔''

''کل رات کی امداد کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔''

وہ چٹان کی بلندی پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔''ہوا ہے۔مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ دن اور دوسری رات بھی گزر گئی۔تیسری صبح سردار بہت بے چین تھا۔سکون

سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ کبھی چٹان کے ایک سرے کی طرف جاتا تھا اور کبھی دوسرے سرے کی طرف... لیکن لشکری امداد آنے کے کہیں آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

دوسری طرف سکندر بڑے اطمینان سے ایک خیمے میں بیٹھا ہوا تھا۔ فوجی اپنے ہتھیار تیز کر رہے تھے۔ ان قبیلے والوں سے کسی بھی وقت جنگ چھڑ سکتی تھی۔ لیکن صبح کے بعد دوپہر اور دوپہر کے بعد سہ پہر بھی گزر گئی۔ تب مقدونیوں نے دیکھا کہ چٹان کی بلندی سے سینکڑوں افراد نیچے آ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اس میدان میں جہاں مقدونوی فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا' قبائلی افراد جمع ہو گئے۔ سردار نے اپنی تلوار سکندر کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ تلوار تیرے حکم کی غلام ہے۔''

سکندر نے وہ تلوار اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شہزوروں کی تلاش ہے' کمزوروں کی نہیں...''

پرامن معاہدے کے بعد قبیلے کے سردار نے مقدونیوں کے لئے پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ گفتگو کے دوران سکندر نے اسے بتایا کہ وہ مقدونیہ سے یہ عزم لے کر نکلا ہے کہ ایشیا فتح کرنے کے بعد ہی اپنی سلطنت میں دوبارہ قدم رکھے گا۔ سردار نے ایک ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''حوصلے بلند ہوں تو فتوحات مقدر بن جاتی ہیں۔ پھر بھی مستقبل کا حال جاننا ضروری ہوتا ہے۔ کیا تُو نے اس سلسلے میں کسی کاہن کی خدمات حاصل کی ہیں؟''

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کبھی زندگی کے کسی مرحلے پر کہانت کا سہارا نہیں لیا۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''اگر ایشیا جانے سے پہلے تیری آزمائش ہو جائے تو کیسا رہے گا؟''

سکندر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''ان پہاڑی علاقوں میں گارڈیم (Gordium) نامی ایک بستی ہے، وہاں ایک بگھی مدت سے اپنے اصل



مقام پر محفوظ کھڑی ہے۔ اس بستی کا بانی اسی پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ وہ بگھی ہمارے لئے بہت مقدس ہے۔ گارڈیم کے پروہتوں اور پجاریوں نے کہا ہے کہ وہ بگھی جہاں کھڑی ہے' وہیں کھڑی رہے گی۔ پھر ایک آدمی آئے گا، جو جوئے کی گانٹھ کھولے گا اور جو آدمی ایسا کرے گا' وہ ایشیا کا بہت بڑا بادشاہ بن جائے گا۔''

سکندر نے کہا۔ ''وہ بگھی تیرے علاقے میں کھڑی ہے۔ اگر پروہتوں کی بات سچ ہے تو پھر تُو نے وہ گرہ کھولنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''تُو کیا سمجھتا ہے' میں نے کوشش نہیں کی ہو گی؟''

سکندر سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''میں نے کئی طرح کے حربے آزمائے مگر ناکام رہا۔ کیا تُو خود کو نہیں آزمائے گا؟''

سکندر نے مسکرا کر کہا۔ ''کیوں نہیں۔ ضرور آزماؤں گا۔ مگر نتیجہ جو بھی نکلے۔ ایشیا کی طرف پیش قدمی سے باز نہیں آؤں گا۔''

چنانچہ وہ سردار سکندر اور اس کے وفاداروں کو گارڈیم کے اس مقام پر لے گیا' جہاں وہ بگھی برسوں سے جوں کی توں کھڑی ہوئی تھی۔ سکندر بغور اس کا مشاہدہ کرنے لگا۔ ایسے وقت سینکڑوں علاقائی افراد ان کے اردگرد یوں جمع ہو گئے تھے' جیسے کوئی تماشہ دکھایا جا رہا ہو۔ سب ہی اس تجسس میں مبتلا تھے کہ مقدونوی بادشاہ کامیاب ہو گا یا ان کے سردار کی طرح نامراد لوٹے گا؟

سکندر دیکھ رہا تھا۔ اس موٹے رسّے کی گرہ اس طرح لگائی گئی تھی کہ دونوں سرے گرہ کے اندر پھنس گئے تھے۔ لہٰذا اس گانٹھ کو کھولنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اسے ڈھیلا کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ سکندر نے تماشائیوں کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لئے اس رسّے کو تلوار سے کاٹ دیا تھا۔ جبکہ مؤرخ ہیرلڈ لیم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سکندر نے اس مقدس بگھی میں سے لکڑی کی ایک میخ نکال دی تھی، جس کے باعث وہ رسّہ ڈھیلا پڑ گیا اور اس کے دونوں سرے سکندر کے ہاتھ آ گئے۔ یوں وہ اس مضبوط گرہ کو کھولنے میں کامیاب ہوا۔

اس کی کامیابی پر قبیلے کے سردار نے بلند آواز میں کہا۔ ''پیش گوئی پوری ہو چکی ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت شاہ مقدونیہ کو ایشیا پر حکومت کرنے سے روک نہیں سکے گی۔''

یہ خبر جلد ہی دور دراز کے علاقوں میں بھی پھیلتی چلی گئی۔ یوں مزید کئی قبائل اس کی طاقت اور عظمت سے متاثر ہو کر کسی جنگ و جدل کے بغیر اس کے باج گزار بن گئے۔ ہر طرف یہی بازگشت سنائی دے رہی تھی کہ مقدونیہ کے سنہری بالوں والے آقا کو آسمانی حمایت حاصل ہو رہی ہے۔ اس واقعہ کے بعد سکندر کو مزید سینکڑوں رضا کار مل گئے۔ فوجی قوت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ سکندر نے خوش ہو کر کہا۔ ''مقدونوی فوج ایسا سمندر بن گئی ہے، جس میں مختلف افواج کے دریا گرتے چلے جا رہے ہیں اور اس کی طاقت کو بڑھا رہے ہیں۔''

چند روز قیام کے بعد سکندر کے حکم پر فوج نے پیش قدمی شروع کی۔ وہ جنوبی حصوں سے گزرتے ہوئے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچ گئے، جس کے آگے دور تک میدانی علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ وہاں کی زمین کا رنگ سرخی مائل تھا۔ ہر طرف گرد و غبار دکھائی دے رہا تھا۔

سکندر پہاڑ کی بلندی سے دور و نزدیک کا جائزہ لینے لگا۔ کہیں کہیں گرم علاقوں میں پیدا ہونے والے درختوں کے سبز جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ مقدونوی فوج سرد و گرم علاقوں کے ایسے سنگم پر پہنچ گئی تھی، جہاں ان کے پیچھے برف سے ڈھکی ہوئی سیاہی مائل چٹانیں تھیں، وہاں یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں اور سامنے نشیب میں وہ گرم خطہ پھیلا ہوا تھا۔

سکندر نے اسی مقام پر پڑاؤ کا فیصلہ کیا اور گرد سواروں کو اس میدانی علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔ دوسرے ہی روز یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ اس نشیبی علاقے کا نام سلشیا ہے اور مقدونوی فوج اس وقت بابِ سلشیا پر قیام پذیر ہے۔

سکندر کے حکم سے اگلی صبح پیش قدمی کی گئی۔ وہ منظم فوج آگے بڑھتی ہوئی سرخی



مائل میدان میں پہنچی تو سورج کی حدت میں نمایاں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ گرمی کی شدت نے سب ہی کو نڈھال کر دیا تھا۔ وہ سرسبز جنگلوں میں پڑاؤ ڈالتے پھر اگلی صبح کوچ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگتے۔

اہلِ مقدونیہ پیش قدمی کے ساتھ ساتھ گرد و پیش کی چیزوں کا معائنہ اور مشاہدہ بھی کرتے جا رہے تھے۔ مثلاً رات کے وقت ان کی نگاہیں ستاروں کے جھرمٹ پر ہوتیں۔ جتنا راستہ طے کرتے، اس کی پیمائش کرتے جاتے۔ فوج کے ہمراہ جو طبیب تھے، وہ ہر علاقے میں نئی نئی بیماریوں کا حال معلوم کر لیتے تھے۔ جتنی بھی نئی نئی چیزیں ملتی تھیں، مثلاً نئے پودے، گھونگے، چوپائے، کیڑے مکوڑے یا پرندے، ان کے نمونے جمع کر کے ارسطو کی تجربہ گاہ میں بھیج دیئے جاتے۔ جس مقام سے گزرتے وہاں کے باشندوں سے ڈھیروں معلومات حاصل کرتے جاتے۔

دورانِ کوچ ایک علاقے سے گزرتے ہوئے شاہی طبیب نے کہا۔ ''یہ گرم وادی بیماریوں کی سرزمین ثابت ہو رہی ہے۔ یہاں بخار کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔''

سکندر نے مسکرا کر کہا۔ ''بخار....؟ مگر یہ تو سردیوں کی بیماری ہے۔''

طبیب نے کہا۔ ''یہ وبائی بخار سردی کے باعث نہیں بلکہ مچھروں کے کاٹنے سے ہوتا ہے اور وہ امراض پیدا کرنے والے مچھر ٹھہرے ہوئے پانی پر پرورش پاتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی جوہڑ میں نہانے سے احتیاط برتی جائے۔''

گرمی کی شدت نے برا حال کیا ہوا تھا۔ سکندر فوج کی قیادت کرتا ہوا، بیوسی فالس کو دوڑاتا ہوا آگے آگے جا رہا تھا۔ سورج جیسے سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ پھر کپڑے اتار کر قریبی ندی میں کود پڑا۔ اس ندی میں پگھلی ہوئی برف کا ٹھنڈا پانی بہہ رہا تھا۔ گرم جسم پر برفیلے پانی نے یہ اثر دکھایا کہ اس کا جسم اینٹھ گیا، پھر وہ سخت بخار میں مبتلا ہو گیا۔

شاہی طبیب بخار کے توڑ کے لئے مختلف دوائیں تیار کرنے لگا۔ ایسے وقت

سکندر نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کسی ٹھہرے ہوئے جوہڑ میں چھلانگ نہیں لگائی تھی، وہاں کوئی مچھر نہیں تھا۔ یہ بخار کی ایک نئی قسم ایجاد ہو رہی ہے۔''

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیسا علاقہ ہے' جہاں صاف ستھرے پانی میں نہانے سے بھی بیماری ہو جاتی ہے؟''

کئی دن گزر گئے لیکن بیماری تھی کہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جب طبیب خاص بخار کو زائل کرنے کے سلسلے میں ناکام رہے تو سکندر نے ارکانیا کے ایک طبیب کو بلایا۔ وہ اس کا معائنہ کرنے کے بعد بولا۔ ''تجھے تیز جلاب لینا چاہئے۔''

پھر وہ دوا بنانے کے لئے خیمے سے باہر چلا گیا۔ ایسے ہی وقت پارمینیو نے اپنے قاصد کے ذریعہ ایک تحریری پیغام بھجوایا۔ سکندر اس خط کو پڑھنے لگا۔ پارمینیو نے لکھا تھا۔ ''اے شاہ مقدونیہ! ہوشیار رہ.... تُو نے ارکانیا کے جس طبیب کو علاج کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس پر ہرگز بھروسہ نہ کر۔ میں نے معلومات حاصل کی ہیں، اس معالج نے شہنشاہِ ایران سے رشوت لے کر شاہ مقدونیہ کو ہلاک کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔''

سکندر اس خط کو پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے کانوں میں اپنے اتالیق ارسطو کے فقرے گونجنے لگے۔ ''ہمیشہ یاد رکھنا' زندگی معالج کے ہاتھوں میں نہیں' اوپر والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کبھی شفا دیتا ہے' کبھی مسلسل بیماری دیتا ہے اور کبھی موت کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے' وہی ہوتا ہے اور وہی ہونا بھی چاہئے۔''

وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ طبیب دوا کا پیالہ لے آیا۔ سکندر نے وہ خط تہہ کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھا اور طبیب سے پیالہ لے کر دوا پینے لگا۔ جب دوا ختم ہو گئی تو اس نے وہ خط نکال کر اس معالج کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد شدید حیرانی سے سکندر کا منہ تکنے لگا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''ایسے کیا



دیکھ رہا ہے؟''

''تیرا اعتماد دیکھ رہا ہوں۔ خطرے سے آگاہ ہونے کے باوجود تُو نے مجھ پر بھروسہ کیا۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''تجھ پر نہیں' مجھے اپنے اتالیق کے اقوال پر بھروسہ ہے۔''

اس واقعہ کے بعد اس معالج نے تسلیم کر لیا کہ وہ شہنشاہ ایران کی سازش کے تحت وہاں آیا ہے۔ مگر وہاں آ کر سکندر کو دیکھا' اس کی شخصیت سے متاثر ہوا تو اس کے ضمیر نے ارادہ بدل دیا۔ سکندر نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اب تیرا کیا خیال ہے؟''

وہ اس کے قدموں میں جھکتے ہوئے بولا۔ ''سارا بھید کھل چکا ہے۔ واپس جاؤں گا تو شاہ ایران مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہاں رہوں گا' تب بھی مارا جاؤں گا۔ یہ سر تیرے قدموں میں جھکا ہوا ہے۔ بادشاہ کوئی بھی ہو میرے سر کا تن سے جدا ہو جانا یقینی ہو گیا ہے۔''

سکندر خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ اس معالج کو شاہی اطباء میں شامل کر لیا جائے۔

جلاب نے سکندر کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ وہ معالج دن رات اس کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ اس کی ادویات سے کسی حد تک افاقہ ہو رہا تھا مگر بیماری مکمل طور پر ختم نہیں ہو رہی تھی۔ پیش قدمی کرتے رہنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا بیمار بادشاہ کو پالکی میں سوار کر کے لے جایا جاتا تھا۔ ان حالات میں فوج کی رفتار بھی سست پڑ گئی تھی۔ اسی لئے طرسوس سے خلیج اسوس تک پھیلے ہوئے میدان کو عبور کرنے میں خاصا وقت صرف ہو رہا تھا۔ وہاں بھی موسمی بخار کا زور تھا۔ فوج کے دوسرے کئی سپاہی بھی بیمار ہو رہے تھے۔ صورتحال کافی تشویشناک ہوتی جا رہی تھی۔

دوسری طرف یہ فکر بھی تھی کہ ایرانی دشمن ابھی تک سامنے نہیں آئے تھے۔ تاہم سکندر کو یہ خبریں مل رہی تھیں کہ مخالفین کے خفیہ کارندے آس پاس کے قصبوں میں

ہنگامے کرتے پھر رہے ہیں۔ توقع کی جا رہی تھی کہ ایرانی فوج صرف دو دن کی مسافت پر رہ گئی ہے۔ مقدونوی فوج جلد ہی ان کے قریب پہنچ جائے گی۔ مگر فی الحال ان کا کوئی نشان دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

سکندر کی نظریں اپنے جانبازوں پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کی بیماری اور دشمن کی طرف سے ملنے والا ذہنی دباؤ ان کے حوصلے پست کر رہا تھا۔ سپاہیوں کے جوش و خروش کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ لہٰذا وہ بیماری کو نظر انداز کر کے ان کے درمیان آ کر بیٹھ جاتا۔ بات چیت کے ذریعہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا۔ اس نے کہا۔ ''ہماری مایوسی دشمن کے حوصلے بڑھا سکتی ہے۔ اہلِ مقدونیہ کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ بلند حوصلہ رہ کر دشمنوں کو مایوسیوں میں مبتلا کرتے رہیں۔''

ایک سپاہی نے کہا۔ ''لیکن وہ دشمن ہیں کہاں؟ سامنے بھی تو آئیں۔''

ایک کماندار نے کہا۔ ''وہ ایرانی دشمن عسکری حکمتِ عملیوں میں اور انوکھی پیش قدمی میں ماہر لگتے ہیں۔''

سکندر نے کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ کیا تم نے شمالی علاقوں سے آنے والی خوش کن خبریں نہیں سنیں؟ بطلیموس نے یہ خوشخبری بھیجی ہے کہ دشمن کے جو دستے ہیلی کارنوسس میں لڑ رہے تھے، انہوں نے مقدونوی دستوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔''

ایسی حوصلہ افزا خبر سن کر فوجیوں کے اندر نیا اعتماد پیدا ہونے لگا۔ سکندر نے خلیج اسوس میں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ وہاں بیمار فوجیوں کا علاج ہو رہا تھا۔ اس کی صحت بھی رفتہ رفتہ بحال ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ بیمار سپاہیوں کو علاج کی غرض سے وہیں چھوڑ کر فوج کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

ان کے دائیں طرف سمندر تھا اور بائیں طرف پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سکندر اب پالکی استعمال نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے عزیز ترین گھوڑے بیوسی فالس پر سوار فوج کی قیادت کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دورانِ کُوچ موسم نے تیور بدلے اور موسلا دھار



بارش شروع ہوگئی۔ یہ رکاوٹ غیر متوقع تھی۔ دشمن تک پہنچنے کے لئے بارش تھمنے کا انتظار ہونے لگا۔ ایک رات اور ایک دن کے بعد جب مطلع صاف ہوا تو سکندر کو ناقابلِ یقین خبریں موصول ہوئیں۔

اس کے گردسواروں نے آ کر بتایا کہ اہلِ مقدونیہ جس ایرانی فوج کی تلاش میں آگے بڑھ رہے ہیں، تیزی سے پیش قدمی کرتے آ رہے ہیں، وہ ان کے عقب سے نمودار ہونے والی ہے۔ یعنی دشمنوں نے پیچھے سے مقدونیوں کا راستہ کاٹ دیا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے انہیں گھیرے میں لے رہے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ بری خبر یہ ملی کہ سکندر نے جن سپاہیوں کو بیماری کے باعث اسوس میں چھوڑ دیا تھا، ایرانیوں نے انہیں بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ یہ ایسی غیر متوقع خبریں تھیں کہ کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایرانی فوج نے گویا جنگ کی صورت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ سکندر نے بھرپور یقین کے لئے اپنے چند منتخب آدمیوں کو کشتی میں بٹھا کر اسوس کی طرف روانہ کر دیا۔ تا کہ وہ خود اس علاقے کے حالات دیکھ کر درست خبریں لائیں۔

دن ڈھلنے سے پہلے پہلے وہ مخبر یہ خبر لائے کہ ایرانی فوج نے خلیج اسوس کو اپنے محاصرے میں لے لیا ہے۔ ساحلی علاقے میں سمندر سے پہاڑوں تک فوجی ہی فوجی دکھائی دے رہے ہیں۔ واپس جانے کی صورت باقی نہیں رہی ہے۔

ایسے تشویشناک حالات نے سکندر کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ مگر وہ خود کو مطمئن رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کامیابی کا یقین تھا یا نہیں تھا لیکن وہ اپنے جانبازوں کو یقین دلا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم جس واقعہ کو اپنے لئے بہت بڑی مصیبت سمجھ رہے ہو، وہ دراصل کامیابی کی سب سے بڑی کلید ہے۔ اب تک تمہیں کوئی قوت شکست نہیں دے سکی۔ یہ یقین رکھو کہ اب بھی تم شکست نہیں کھاؤ گے۔ بے شک، دشمن فوج کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مگر محاذ تنگ ہے، ایسی صورت میں بڑی تعداد کوئی کارنامہ انجام نہیں دے پائے گی۔ تمہاری تعداد کم ہے۔ تم اپنی قوت سے

پورا فائدہ اٹھا سکو گے۔ ایک طرف سمندر تمہارا محافظ ہوگا اور دوسری طرف یہ پہاڑ ....“

وہ اپنے فوجیوں کو سابقہ کارنامے یاد دلا کر بدستور ان کا حوصلہ بڑھانے کی کوششیں کرتا جا رہا تھا۔ جب اندھیرا پھیلنے لگا تو اس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ آدھی رات کے بعد مقدونوی فوج اس درّے پر پہنچ گئی' جو خلیج اسوس کے سامنے واقع تھا۔ وہاں قیام کے دوران سکندر نے سپاہیوں کو سوجانے کی مہلت دی۔ پھر صبح کی روشنی نمودار ہونے کے ساتھ ہی پیش قدمی شروع کر دی گئی۔ مقدونیوں کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ایران کی قوت ان سے کم از کم تین گنا زیادہ ہے۔

اسوس کے میدان میں غیر متوقع طور پر جو کچھ پیش آیا' اسے سمجھنے کے لئے یہ مان لینا ضروری ہے کہ مقدونوی فوج ایک خاص نقشہ عمل پر کاربند تھی۔ وہ مدت سے لڑائیوں میں مشغول چلی آ رہی تھی۔ ہر سپاہی کو جنگجوئی کا وسیع تجربہ حاصل ہوگیا تھا۔ ہر دستے کو اپنا مقام معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی معلوم رہتا تھا کہ اسے کس لمحے میں کیا کام انجام دینا ہے؟ اس اعتبار سے سکندر کی فوج تجربہ کار اور منظم لشکر کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ فیلقوس نے اپنی زندگی میں فوج کے افسروں اور دستوں کے تمام سالاروں کو زبردست عسکری چالوں کی تربیت دی تھی۔

مقدونوی فوج اپنی خفیہ عسکری چالوں کے ذریعہ ہر میدان میں کامیابیاں حاصل کرتی چلی آ رہی تھی۔ وہاں بھی ان کا تجربہ اور فوجی طریق کار کام آیا۔ جب وہ لشکر تنگ درّے سے گزرتا ہوا سامنے آیا تو ایرانی فوج انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ سکندر کے لشکر کو عقب سے گھیر کر پسپا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن محاصرے سے پہلے ہی وہ اچانک پلٹ کر مقابلے پر آگئے تھے۔

پھر وہ تنگ دُرّہ ایسا تھا کہ پوری ایرانی فوج ان پر بیک وقت دائیں بائیں سے حملے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے دستوں میں بٹ کر مقابلے پر آ رہے تھے اور ان کی تلواروں سے زیادہ تیروں سے چھلنی ہو رہے تھے۔ مقدونوی تیر انداز بڑے



بڑے پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے محفوظ رہ کر تیر اندازی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ایرانی سپہ سالار دیکھ رہے تھے کہ ان کا ایک مقدونوی سپاہی مارا جاتا ہے تو ایرانی فوج اپنے دس سپاہیوں کی لاشیں چھوڑ کر پلٹ آتی ہے۔

ایسے وقت ایران کا شہنشاہ دارا فوج کے پیچھے ایک جنگی رتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ فوج کا اگلا دستہ اپنے سپاہیوں کی لاشیں چھوڑ کر پلٹ آیا ہے اور قلبی دستے کی صف بندی توڑ دی ہے تو اس نے فوراً ہی یہ حکم دیا کہ اس کے رتھ کو پیچھے ہٹایا جائے۔ وہ عارضی طور پر پیچھے ہٹنا چاہتا تھا۔ پھر نئی منصوبہ بندی سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ان حالات میں ایک جگہ رتھ کو پیچھے پلٹنے کا راستہ نہ ملا تو وہ نیچے اتر کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا اور محافظ فوج کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔ یوں اچانک ہی منہ پھیر کر جانے کے باعث سپاہ سالار اور سپاہیوں نے یہی سمجھا کہ شہنشاہ دارا نے پسپائی قبول کر لی ہے۔ چنانچہ سب ہی پلٹ کر فرار کا راستہ اختیار کرنے لگے۔

میدانِ جنگ دشمنوں سے خالی ہوگیا۔ مقدونوی سپاہی دارا کی ڈھال' کمان اور شاہی بالا پوش سکندر کے پاس لائے۔ جنہیں شہنشاہ ایران اپنی جنگی رتھ میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ فوج جو تعداد میں تین گنا زیادہ تھی' وہ سکندر کے حوصلے اور بہترین حکمت عملی سے شکست کھا کر فرار ہوگئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی اور غیر متوقع کامیابی تھی۔

سکندر اگرچہ بیمار اور زخمی تھا' تاہم اس نے فوج کو جشن منانے کی اجازت دی۔ ایران کے شاہی کیمپ میں خزانے کا خاصا بڑا حصہ رہ گیا تھا۔ سکندر نے وہ مال ان افسروں میں تقسیم کر دیا' جنہوں نے جنگ اسوس میں امتیازی کارنامے انجام دیئے تھے۔ ایرانیوں کے لئے سکندر کا طرز عمل نہایت ہی نرم اور احسان مندانہ تھا۔

مقدونوی افسران سکندر کو شہنشاہ ایران کی خیمہ گاہ میں لے آئے تھے۔ وہاں رنگ برنگے شامیانوں میں خوبصورت فانوس جگمگا رہے تھے۔ فرش پر اعلیٰ درجے کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سکندر کو سنگ سلیمانی کا ایک حوض دکھایا۔ جس کا پانی صاف و شفاف تھا اور وہاں سے نہایت عمدہ خوشبو پھیل رہی تھی۔ وہ سب اپنی

آستینیں چڑھا کر اس خوشبودار پانی سے منہ ہاتھ دھونے لگے۔ ان میں سے ایک افسر نے پانی کی ٹھنڈک اور خوشبو سے مست ہو کر کہا۔ ''ہم اپنا گرد و غبار دارا کے حمام میں دھو رہے ہیں۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''یہ اب دارا کا نہیں' سکندر کا حمام ہے۔''

سکندر حوض میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس پر تازہ پانی ڈالا گیا۔ بدن کی مالش کی گئی۔ وہاں کی فضاء گلاب کے عرق سے معطر تھی۔ وہ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''واہ کیا بادشاہی کی شان ہے.... تو لئے ایسے نرم اور گداز ہیں' جیسے بلی کے روئیں ہوتے ہیں۔''

ایک خیمے میں شاہی پکوان تیار تھا۔ سکندر پہلی بار ایرانی کھانوں کی لذت سے آشنا ہوا۔ اس کے افسر اور سپاہی بھی خوب سیر ہو کر کھاتے رہے۔ وہ سب شراب پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہوئے اپنے زخموں کو سہلا رہے تھے۔ ان کے دلوں میں سکندر کے لئے ایک خاص احترام پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اسے دیوتا قرار دیتے تھے۔ اس کے آگے سر جھکاتے تھے اور اس کے ہاتھوں کو چومتے تھے۔

خیمہ گاہ میں پہلی بار بے شمار ایشیائی عورتیں دیکھنے کو ملیں۔ ان میں ملک شام کی طرح دار حسینائیں بھی تھیں، سولہ سنگھار کی ہوئی قبرص کی عورتیں اور ممفس کی نیم حبشی نژاد دوشیزائیں بھی تھیں۔ سکندر اپنے فوجیوں سے وعدہ کر چکا تھا کہ فتح حاصل کرنے کے بعد ان کی تمام ضرورتیں پوری کرے گا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ وعدہ پورا کیا جائے۔

عین اس وقت اطلاع پہنچی کہ دو فوجی افسروں نے ایک شکست کھا کر فرار ہونے والے کی بیوی سے زیادتی کی ہے۔ سکندر نے پارمینیو کو حکم دیا۔ ''فوراً اس معاملے کی تفتیش کرو۔ اگر ان مجرم افسروں کا جرم ثابت ہو جائے تو انہیں وہیں قتل کر دو۔''

پھر اس نے ہدایت کی۔ ''شکست کھانے والے خواہ بربری ہوں' ایشیائی ہوں یا ایرانی.... ان کی عورتوں کا پورا احترام کرو۔ جو بھی کمزور عورتوں سے زیادتی کرے گا'



اسے سزائیں ضرور دی جائیں گی۔''

ایک افسر نے کہا۔ ''تیری شادی نہیں ہوئی۔ تُو نے کبھی کوئی عورت اپنے پاس نہیں رکھی۔ کسی یونانی طوائف کو بھی ساتھ نہیں لایا۔ تُو نہیں جانتا' عورت کی طلب کیا ہوتی ہے؟''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''تُو نے مقدونیہ میں شادی نہیں کی۔ ہمارا مشورہ ہے' یہاں کسی سے شادی کر لے یا کسی کو داشتہ بنا لے۔ آخر کسی جانشین کو تو پیدا کرنا ہی ہے۔ اس طرح جانشینی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور عورت کی قربت سے تجھے ہماری محرومیوں کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔''

سکندر نے ان افسروں اور سپاہیوں کو شادی کی اجازت دی' جو اب تک کنوارے تھے۔ اس بات کی سختی سے ممانعت کی کہ کسی بھی عورت سے ناجائز تعلقات نہ رکھے جائیں۔ ایسے وقت ایک خیمے سے آہ و فغاں کی صدائیں سنائی دیں۔ سکندر نے پوچھا۔ ''یہ ماتمی آوازیں کیسی ہیں؟''

اس کے رفیقوں نے بتایا کہ اس خیمے میں دارا کی خواتین موجود ہیں۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ دارا کی ڈھال اور کمان میدانِ جنگ میں پائی گئی ہے۔ اس طرح وہ سمجھ رہی ہیں کہ دارا مارا گیا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ اس خیمے میں دارا کی ماں' بیوی اور دو بیٹیاں ہیں۔

سکندر نے ان خواتین کی غلط فہمی دور کی۔ ان سے کہا۔ ''میرے پاس دارا کی صرف ڈھال اور کمان ہے۔ وہ زندہ ہے اور فرار ہو گیا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم سے کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ تم پہلے کی طرح شان و شوکت سے رہو گی۔''

سکندر عورتوں سے کتراتا رہتا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی ماں اولمپیاس نے اپنے روّیوں سے اس کے ذہن پر ناخوشگوار اثرات چھوڑے تھے۔ اسے ہر عورت اپنی ماں کی طرح ضدی اور مغرور نظر آتی تھی۔ پھر بھی

اس نے اپنے افسروں کے مشوروں کو قبول کیا کہ اب اسے شادی کر لینی چاہئے۔

وہ شکست کھانے والے افسران اپنی جن عورتوں کو پیچھے چھوڑ گئے تھے' ان میں ایک برسین نامی حسینہ بھی تھی۔ سکندر نے اسے بیوی بنا کر رکھ لیا۔ برسین کو شادی اور ازدواجی زندگی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ سکندر کے پاس ایسے آتی تھی' جیسے مجبوراً فرض ادا کرنے آرہی ہو۔

وہ سکندر سے اپنے اندرونی جذبات چھپاتی تھی۔ اس کے پاس ہاتھی دانت کی ایک چھوٹی سی' خوبصورت سی صندوقچی تھی۔ اس صندوقچی میں قفل نہ تھا۔ وہ ایک خاص خفیہ گرفت کے ذریعہ کھلتی اور بند ہوتی تھی۔ برسین اسے اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ صرف تنہائی میں اس صندوقچی کو کھولتی تھی۔ اکثر چاندنی راتوں میں بڑے جذبے سے اسے کھول کر دیکھتی رہتی تھی۔

سکندر کے پاس بھی ہاتھی دانت کا ایک صندوقچہ تھا' جسے وہ مقدونیہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ جب بھی تنہا ہوتا تھا تو اسے کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ برسین دیکھتی تھی کہ اس کے آتے ہی وہ اس صندوقچے کو بند کر دیتا ہے۔ عورتوں سے کوئی چیز چھپائی جائے تو وہ تجسس میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس نے پوچھا۔ ''ایسا کونسا راز ہے' جسے تُو مجھ سے چھپاتا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اس لئے چھپاتا ہوں کہ اس میں جو کچھ ہے' اس کا تعلق صرف میری ذات سے ہے۔ تجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔''

''پھر بھی... معلوم تو ہو۔ کیا میں دیکھ نہیں سکتی؟''

سکندر نے اس صندوقچے کو کھول کر دکھایا۔ اس نے اپنے استاد ارسطو سے جتنا علم حاصل کیا تھا' ان علوم سے تعلق رکھنے والی خاص خاص باتوں کو یادداشت کے طور پر لکھ رکھا تھا۔ انہیں تنہائی میں پڑھتا تھا۔ ان اصولوں اور استاد کی ہدایات کے مطابق ان پر عمل کیا کرتا تھا۔ تحریری مسودوں کو دیکھ کر برسین کا تجسس ختم ہو گیا۔

سکندر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے خیمے میں لے آیا۔ وہ خیمہ برسین کے لئے



تھا۔ سکندر نے ایک جگہ چھپی ہوئی صندوقچی کو اٹھا کر پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

وہ کچھ پریشان سی' بے چین سی ہو گئی۔ وہ بولا۔ ''میں نے اکثر چاندنی راتوں میں دیکھا ہے' تُو اسے بڑی رازداری سے کھولتی ہے اور اس کے اندر کچھ دیکھتی رہتی ہے۔''

''پھر تو تُو نے دیکھا ہو گا کہ اس صندوقچی میں کیا ہے؟''

''نہیں۔ میں نے دور سے دیکھا ہے۔ آج قریب سے دیکھ رہا ہوں۔''

وہ اسے کھولنے کی کوششیں کرنے لگا۔ حیرانی سے کہنے لگا۔ ''یہ کہیں سے مقفل نہیں ہے۔ پھر تُو اسے کس طرح کھولتی اور بند کرتی ہے؟''

''میں چاہتی ہوں' تُو مجھ سے یہ سوال نہ کر۔ اسے کھول کر نہ دیکھ۔ مجھ پر یقین کر' اس میں میرے لئے یا تیرے لئے زہر نہیں ہے۔''

وہ بولا۔ ''یہ انسانی فطرت ہے' اس سے کوئی چیز چھپا کر رکھی جائے تو وہ اسے ڈھونڈ نکالنے اور دیکھنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ تُو میرے تجسس کو نہ بھڑکا۔ میں نے تیری بات مانی' تُو میری مان لے۔''

سکندر نے صندوقچی اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ سمجھ گئی کہ بھید کھل کر رہے گا۔ اس نے صندوقچی کو لے کر اسے ایک جگہ انگوٹھے سے دبایا تو وہ کھل گئی۔ اندر کچھ چمکتے دمکتے ہیرے جواہرات تھے' ایک خوبصورت سا بازو بند تھا۔ جس پر یہ عبارت کندہ تھی

''میمنان کی طرف سے اپنی برسین کو تحفۂ محبت...''

ایرانی فوج کے ایک بہادر سپہ سالار کا نام میمنان تھا۔ برسین اس کی بیوہ تھی۔ وہ جنگ اسوس میں مارا گیا تھا۔ وہ اسے اتنی دیوانگی سے چاہتی تھی کہ سکندر جیسے فاتح کے پاس آکر بھی اپنے آنجہانی محبوب کو یاد کرتی رہتی تھی۔ چاندنی راتوں میں اس بازو بند کو دیکھتی تھی' اس پر کندہ کئے ہوئے محبت بھرے فقرے کو پڑھتی تھی۔ اسے چومتی تھی' سینے سے لگاتی تھی۔ اس پر آنسوؤں کے قطرے ٹپکاتی تھی۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر اسے صندوقچی میں رکھ دیتی تھی۔

سکندر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں نے انجانے میں تجھ پر ظلم کیا ہے۔ میرے افسروں نے درست کہا تھا کہ عورت کی قربت مجھے بہت کچھ سکھائے گی۔“

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”میں بہت نہ سہی‘ کچھ تو سیکھ رہا ہوں۔ یہ سمجھ رہا ہوں کہ ہر عورت میری ماں کی طرح مغرور اور اپنے شوہر کی دشمن نہیں ہوتی۔ تیری طرح محبت کرنے والیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ اب اس دنیا میں واپس نہیں آئے گا۔ مگر تُو اس کے تحفے کو سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ مجھ جیسا فاتح بھی تجھے فتح نہیں کر سکتا۔ میں عورت کا یہ نیا روپ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ جا... میں نے تجھے آزاد کیا۔“

برسین فرطِ مسرت سے اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر رونے لگی۔ سکندر نے ایک افسر کو بلا کر حکم دیا۔ ”دشمن کے جو سپاہی جنگی قیدی بنائے گئے ہیں‘ ان میں سے دس قیدیوں کو آزاد کیا جائے اور ان کی نگرانی میں برسین کو ایران بھیج دیا جائے۔“

ایران کے شہنشاہ دارا سے کئی شرائط پر صلح ہو چکی تھی۔ لیکن یہ دارا کی بدبختی تھی کہ صلح ہونے کے بعد زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔ اسے شاہی خاندان کے ایک فرد نے خنجر گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ دارا نے بھی اپنے پیشرو کو قتل کر کے تاج و تخت حاصل کیا تھا۔ بادشاہوں کے ساتھ یہی ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ بھی وہی ہوا۔

سکندر کئی علاقوں میں فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا ایکب تانہ پہنچ گیا۔ اس کے لئے یہ علاقہ طبعی اور مادی لحاظ سے زیادہ موزوں تھا۔ اس کے اردگرد سات فصیلیں تھیں۔ گویا وہ ایک وسیع و عریض قلعے میں آ گیا تھا۔ اس نے جنگی اعتبار سے اس جگہ کو پسند کیا تھا۔ وہاں بہت سی کانیں تھیں۔ ان سے کئی طرح کی دھاتیں نکالی جاتی تھیں۔

سکندر کو ایک ایسی جگہ دکھائی گئی‘ جہاں دن رات آگ جلتی رہتی تھی۔ زمین کی سطح پر جو چھوٹے بڑے گڑھے پڑے ہوئے تھے‘ ان میں سے ایک سیال مادہ ابلتا رہتا تھا۔ وہ پانی طرح بہہ کر ایک چشمے میں جا گرتا تھا۔ وہاں مسلسل آگ کے شعلے بھڑکتے



رہتے تھے۔

مقدونوی سائنس دانوں نے وہاں کا معائنہ کیا پھر یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ ایک نیا عنصر دریافت ہو رہا ہے۔ یہ ایک آتش گیر سیال مادہ ہے۔ اس سیال سے اور اس سے اٹھنے والی بھاپ (گیس) کے مرکب سے جو تجربات کئے گئے، اس سے موجودہ زمانے میں یہ ثابت ہوا کہ وہ پٹرول کی پہلی دریافت تھی۔

سکندر بڑے تجربات حاصل کرتا ہوا‘ فتوحات حاصل کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ جتنی جنگیں جیتتا تھا‘ اُتنے ہی زخم بھی کھاتا رہتا تھا۔ کبھی منجنیقوں سے چھوڑا ہوا پتھر اس کے سر پر آ کر لگا تو دماغ جیسے منجمد ہو گیا۔ کبھی ایسے زخم کھائے کہ بینائی کمزور ہو گئی۔ مگر وہ بڑا سخت جان تھا۔ علاج اور دواؤں کے ذریعہ منجمد دماغ کو پھر فعال بنا لیتا تھا۔ علاج اور دواؤں کے ذریعہ بینائی بھی بحال ہو جاتی تھی۔ جو زخم لگتے تھے‘ وہ بھر جاتے تھے۔ مگر اپنا نشان چھوڑ جاتے تھے۔

وہ مشرقی سمت کے پہاڑی علاقوں کو تسخیر کرتا ہوا اس جگہ پہنچا‘ جو آجکل قندھار کہلاتا ہے۔ اس نے کابل سے آگے شمال کا رخ کیا۔ دنیا کی بلند ترین چوٹیوں سے جو گلیشیر ٹوٹ کر بہتے تھے‘ وہ سیلابی دریا کی صورت میں اس علاقے سے گزرتے تھے۔ سکندر کے حکم سے موٹی اور مضبوط بلیوں پر چمڑا منڈھا گیا۔ پھر اس کے اندر گھاس پھوس بھری گئی۔ مقدونوی فوج نے ایسی کشتیاں بنا کر دریا کو عبور کرنا چاہا تو گھات میں بیٹھے ہوئے دشمن ان پر حملہ کرنے لگے۔ وہ کسی طرح جوابی حملے کرتے ہوئے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس جنگ میں سکندر کی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

کبھی سر پھوٹا‘ کبھی ہاتھ پاؤں ٹوٹے لیکن اس کی مستقل مزاجی اور قوتِ ارادی نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسے ہی لوگ فاتح اعظم کہلاتے ہیں۔ انسانی تاریخ کے سینے پر قیامت تک کے لئے نقش ہو جاتے ہیں۔

===❁===

وہ سخت جان فاتح اپنی فوج کے ساتھ ایک ایسے قلعے تک پہنچ گیا' جو ایک بلند چٹان پر تعمیر کیا گیا تھا۔ لوگ اس علاقے کو صحرائے سغد کہتے تھے۔ وہاں کے حکمران نے سکندر کے لشکر کو میدانی علاقے سے آتے دیکھا تو اپنی فوج اور رعایا کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا۔ وہاں کھانے پینے کا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا تمام سامان موجود تھا۔

سکندر اور اس کے سپہ سالاروں نے سر اٹھا کر اس بلند و بالا قلعے کو دیکھا تو یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ ان کے سپاہی نہ ان چٹانی فصیلوں پر چڑھ سکتے ہیں' نہ حملہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ اس قلعے میں باختری قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر برف پگھلتی ہوئی قلعے تک آتی تھی۔ اس طرح قلعہ بند افراد کو وافر مقدار میں پینے کا پانی مل جاتا تھا۔ یہ قدرتی وسائل بتا رہے تھے کہ وہ ایک طویل عرصے تک اپنے قلعے میں محفوظ رہیں گے۔

سکندر نے انہیں پیغام دیا کہ وہ قلعہ سے باہر اپنے مکانوں میں آجائیں۔ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ ان سے جنگ نہیں کی جائے گی۔ باختری قبیلے کے حکمران نے اس کے اس پیغام کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''نہ ہم تجھ سے خوفزدہ ہیں اور نہ ہی معافی مانگ رہے ہیں۔ تجھے اس قلعے کے اندر پہنچنے کے لئے ایسے پردار سپاہیوں کو لانا ہوگا' جو پرواز کر کے یہاں تک پہنچ سکیں۔''

سکندر اپنے سپہ سالاروں سے مشورے کرنے لگا۔ خود اپنے طور پر تدبیریں



سوچنے لگا۔ پھر اس نے ایسے سپاہیوں کو طلب کیا' جنہیں پہاڑی چٹانوں پر چڑھنے میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے کہا۔ ''اگر تم سب اس قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اپنا پرچم لہراؤ گے تو تم میں سے ہر سپاہی کو بارہ ٹیلنٹ انعام کے طور پر دیئے جائیں گے۔''

بارہ ٹیلنٹ ان کے لئے بہت بڑا انعام تھا۔ وہ تدبیر سوچنے لگے۔ یہ طے پایا کہ رات کے وقت اس طرف سے فصیل پر چڑھا جائے گا' جہاں چٹانیں سیدھی کھڑی ہیں اور قلعہ بند رہنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرف سے چڑھنا ممکن نہیں ہے۔

ان کی یہ تدبیر اچھی تھی۔ مگر خطرات سے پُر تھی۔ وہاں سے گرنے والے زندگی کی طرف لوٹ کر نہیں آسکتے تھے۔ تدبیر اس لئے اچھی تھی کہ باختری قبیلے والوں نے چٹان کے اس حصے کی طرف کوئی حفاظتی تدبیر اختیار نہیں کی تھی۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ادھر سے کبھی کوئی نہیں آسکے گا۔

مقدونوی سپاہیوں نے اسی رات اپنی تدبیر پر عمل کیا۔ انہوں نے اپنے ساتھ خیموں کی آہنی میخیں اور مضبوط رسّے لئے۔ اپنے ایک ایک پرچم کو اپنی اپنی کمر سے لپیٹ لیا۔ وہ موسم سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی رات میں ان عمودی چٹانوں پر چڑھنے لگے۔ ایک ایک ہاتھ کی بلندی پر میخیں گاڑتے جاتے تھے اور رسّے باندھ کر اوپر چڑھتے جاتے تھے۔

وہ تین سو سپاہی تھے۔ بلندی پر پہنچتے پہنچتے تیس سپاہی رات کی تاریکی میں نیچے گر کر کہیں گہری پستیوں میں گم ہو گئے۔ باقی تمام سپاہی طلوعِ آفتاب تک چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں سے انہوں نے اپنے پرچم لہرائے۔ سکندر خوش ہو گیا۔ اس کے افسروں نے پکار پکار کر کہا۔ ''اے باختریو! عقل کے اندھو! ہمارے لہراتے ہوئے پرچم دیکھو۔ ہمارے پَردار سپاہی تمہارے سروں تک پہنچ گئے ہیں۔''

باختری سرداروں نے ان پرچم لہرانے والوں کو دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ مان گئے کہ جو ناممکن کو ممکن بناتے ہوئے ایسی سمت سے آئے ہیں' جہاں سے صرف پرندے ہی آسکتے ہیں تو سکندر کے دوسرے جیالے سپاہی بھی اس قلعے کی ہر چٹان کو توڑ کر اندر

پہنچ سکتے ہیں۔ ان سرداروں نے باہر آ کر سکندر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

پوری فوج کو قلعے کے اندر آ کر پتہ چلا کہ ان پہاڑی باختریوں کی آبادی کم ہے۔ آبادی کی مناسبت سے سپاہی بھی کم تھے۔ قلعہ بند ہو کر یہ سمجھ رہے تھے کہ برفباری کا آغاز ہونے والا ہے۔ مقدونوی فوج آسمانی آفات سے گھبرا کر واپس چلی جائے گی۔ لیکن جو سوچا تھا' وہ نہ ہوا۔

سکندر اس بلند و بالا قلعے میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ وہاں کا جائزہ لینے کے دوران اس نے سنہری بالوں والی ایک خوبصورت دوشیزہ کو دیکھا تو وہ پہلی محبوبہ سنبوری یاد آ گئی' جو ایک درخت کی شاخ سے پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں آ گری تھی۔ بعد میں بطلیموس نے اپنی کمینگی دکھا کر اسے خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔

سکندر اگرچہ رومانوی جذبات نہیں رکھتا تھا۔ تاہم سنبوری لاشعوری طور پر اس کے دل و دماغ میں سمائی رہتی تھی۔ اسے یوں لگا' جیسے سنبوری برسوں بعد ایک حسین دوشیزہ کے روپ میں سامنے چلی آئی ہے۔ وہ لچکتی' مٹکتی' گنگناتی چلی آ رہی تھی۔ اسے اچانک اپنے روبرو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر اپنی بڑی بڑی کٹوروں جیسی آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے بولی۔ ''کیا تُو سکندر ہے؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تُو نے کیسے پہچانا؟''

''اس قلعے میں جگہ جگہ تیرا چرچا ہوتا رہا ہے۔ جہاں جاتی تھی' سنہری بالوں والے جنگجو بادشاہ کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ سنتے سنتے میرے دماغ میں تیری ایک تصویر بن گئی۔ تُو ہُو بہُو ویسا ہی ہے۔''

سکندر مسکرانے لگا۔ اسے اپنے سپہ سالاروں کے مشورے یاد آ رہے تھے کہ اب اسے شادی کر لینی چاہئے۔ برسین کی محبت اور وفا شعاری بھی یاد آ رہی تھی اور اسے سمجھا رہی تھی' پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یہ جو اجنبی دوشیزہ سامنے آئی ہے' سنبوری اور برسین جیسی ہے۔ یہ شوہر کو قتل کرنے والیوں میں سے نہیں ہے۔ اس کے لئے جان دینے والیوں میں سے ہے۔



اس نے پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟''

''میں روشنک ہوں۔ ہمارے بوڑھے کاہن نے کہا تھا' میں بہت نصیبوں والی ہوں۔ مجھے...''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سکندر نے اسے کھینچ کر آغوش میں بھر لیا۔ دبوچتے ہوئے کہا۔ ''کاہن نے کہا تھا' تجھے عروج حاصل ہوگا۔''

روشنک کی زندگی میں کسی مرد کی وہ پہلی گرفت تھی۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ سانسیں لینا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ جیسے ہانپتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔''

''اور کاہن نے کہا تھا' تُو ملکہ بنے گی۔''

اس نے ہاں کہنا چاہا۔ سکندر نے اس ''ہاں'' پر مہر لگا دی۔ یوں آئندہ اس کے ملکہ ہونے کی تصدیق کر دی۔ سکندر کا یہ انتخاب غلط نہیں تھا۔ روشنک ساری زندگی اس کی وفادار بیوی بن کر اسے جسمانی اور ذہنی آرام پہنچاتی رہی۔

سکندر تالاب کے پانی کی طرح ٹھہرنے والا نہیں تھا۔ دریا کی لہروں کی طرح آگے اور آگے رواں دواں رہتا تھا۔ وہ دریائے کابل کو عبور کر کے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے اپنے گرد سواروں کو آگے روانہ کر چکا تھا۔ تاکہ وہ وہاں کے مکمل حالات کا جائزہ لے کر مخالفانہ رکاوٹوں کے مطابق معلومات فراہم کر سکیں۔

پتہ چلا' دریائے سندھ کے آریائی باشندے اس کی برتری قبول کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ سکندر کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کے لشکر اور اس کی فتوحات کا چرچا دور دور تک ہو رہا تھا۔ مختصر یہ کہ انہوں سے اسے خوش آمدید کہا۔ کسی جنگ و جدل اور خون خرابے کے بغیر ہندوستان کی زمین پر قدم رکھنا ایک نیک شگون تھا۔

سکندر اپنے باپ فیلقوس کی طرح حالات اور ماحول کے مطابق رویّہ اختیار کرنے لگا۔ فیلقوس کا یہ بنیادی اصول تھا کہ جس ملک میں جاؤ' وہاں کے لوگوں کے ہم مزاج اور ہم خیال بنتے رہو۔ اس طرح تم تلوار سے نہیں' اپنے حُسنِ عمل سے لوگوں

کے دل جیت لو گے۔

وہ سندھ سے شمال کے بلند پہاڑی سلسلوں کی طرف جاتے ہوئے جن علاقوں کو فتح کرتا تھا' وہاں ان کے لباس پہنتا تھا۔ ان کے طور طریقوں کے مطابق رہن سہن اختیار کرتا تھا۔ مقدونیہ سے ہندوستان تک سکندر نے کبھی تاج نہیں پہنا تھا' کبھی تخت پر نہیں بیٹھا تھا۔ مگر ہندوستانی اسی کو بادشاہ مانتے تھے' جو تاج پہن کر تخت پر جلوہ نما ہوتا تھا۔

جب سکندر تاج پہن کر شاہی لباس میں تخت پر بیٹھتا تھا تو مقدونوی سپاہی منہ دبا کر ہنستے تھے۔ ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہتے تھے۔ ''ہمارا یہ مقدونوی آقا کیا تماشے کرتا پھر رہا ہے؟''

نیسا کے شہر میں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر مقدونیوں نے حقیقی عشق پیچاں کے پودے دیکھے۔ ایسے پودے اب تک کسی گزرگاہ میں نظر نہیں آئے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہاں کے باشندوں کو عشق پیچاں کا مقدونوی نام بھی معلوم ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں' وہ لوگ مقدونوی زبان کے بہت سے الفاظ بھی جانتے تھے۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ ان سے پہلے بھی مقدونوی باشندے وہاں آ چکے تھے اور انہوں نے ہی عشق پیچاں کے پودے وہاں اُگائے تھے۔ اس پودے کی مبارک نمود نے مقدونیوں کے حوصلے بڑھا دیئے، انہوں نے اسے بھی نیک شگون سمجھا۔

وہ آگے بڑھے تو انہیں پہاڑی درختوں کے جنگل میں لمبے سینگوں والے طاقتور بیل دکھائی دیئے۔ انہوں نے ان بیلوں کو قابو میں کیا اور ان کا ایک ریوڑ مقدونیہ بھیج دیا تاکہ وہاں ان کی نسل پیدا کی جا سکے۔ ایشیائے کوچک اور صحرائے سغد کی طرح شمالی ہند کے پہاڑوں میں بھی کتنے ہی وحشی قبیلوں سے ٹکراؤ ہوتا رہا۔ انہی دنوں بطلیموس اپنی فوج کے ساتھ سکندر سے آملا۔ اس طرح ان کی فوجی قوت میں اضافہ ہو گیا۔

وہ پہاڑوں کی بلندیوں پر جتنا آگے بڑھتے جا رہے تھے' اتنی ہی انسانی آبادی کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہاں کی پہاڑیاں اور میدانی علاقے برف سے ڈھکے رہتے تھے۔ فوج کے سپاہ سالار اور سپاہی بیزار ہو گئے تھے۔ ان کی پیش قدمی نتیجہ خیز نہیں



تھی۔ لہٰذا وہ واپس لوٹ کر دریائے سندھ کی طرف چلے آئے۔

وہ دریائے سندھ پر کشتیوں کا پل بنا کر اس پار پہنچے۔ وہاں میلوں دور تک چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے علاقے پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں راجہ امبھی سب سے معروف اور طاقتور حکمران تھا۔ وہ مقدونوی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تحفے کے طور پر بیل گاڑیوں میں سونے اور چاندی کے انبار بھیجے اور اپنے لئے امان چاہی۔ سینکڑوں بیل' بکریاں اور بھیڑیں بھی غذا اور قربانی کے لئے بھیجی گئیں۔ جب مقدونیوں کے آگے تیس عدد ہاتھی پیش کئے گئے تو وہ سب شدید حیرانی سے ان عجیب وغریب جانوروں کو دیکھنے لگے۔

انہوں نے پہاڑ جیسا قوی ہیکل جانور پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ان ہاتھیوں کے چاروں طرف گھوم گھوم کر ان کا معائنہ کرنے لگے۔ سپاہیوں نے ان پر سوار ہو کر گھومنے پھرنے اور بلندی سے نظارے کرنے کا لطف اٹھایا۔ روشنک کے لئے ایک ہاتھی کی پشت پر آرام دہ ہودا باندھا گیا، وہ بہت خوش ہو رہی تھی، اسے یہ سواری اس لئے بھی پسند آئی کہ زمین پر کھڑے ہوئے لوگوں سے بلند ہو کر شاہانہ انداز کی سواری کا مزہ آ رہا تھا۔

سلیوکس ایک قوی ہیکل جنگجو سپاہی تھا۔ کئی جنگوں میں اپنی جواں مردی دکھاتے ہوئے سکندر کا قرب حاصل کر چکا تھا۔ اسے ایک سپاہ سالار کی حیثیت دی گئی تھی۔ وہ ایسا طاقتور تھا کہ سر پھرے بیل کو سینگوں سے پکڑ کر' اس کی گردن مروڑ کر نیچے گرا دیتا تھا۔ جتنا شہزور تھا' اتنا ہی زندہ دل اور خوش گفتار بھی تھا۔ سکندر کے کسی فیصلے پر کبھی اعتراض نہیں کرتا تھا۔

وہ مقدونوی سپاہی ہندوستان میں آ کر نئی نئی اور عجیب وغریب چیزیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک چتکبرے سانپ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ چوبیس فٹ لمبا سانپ انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ اتنی تیزی سے نکل گیا کہ پکڑا نہ جا سکا۔ پھر انہوں نے سبز رنگ کے طوطے دیکھے، جو آدمیوں کی طرح بولتے تھے۔

اگرچہ وہ یونانی زبان نہیں جانتے تھے لیکن ہندی بول کر مقدونیوں کو حیران کر دیتے تھے۔

انہوں نے ایک ایسی چیونٹی دیکھی' جو جسامت میں ایک لومڑی کے برابر تھی۔ وہ زمین کھود کھود کر سونا نکال رہی تھی۔ یہ ایسے نظارے اور ایسے مشاہدے تھے کہ تھکن اور بیزاری کے باوجود مقدونوی سپاہیوں کی دلچسپی ہندوستان سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ مگر ہیرلڈلیم نے اپنی کتاب میں یہی لکھا ہے۔

ایک سپیرے نے سکندر کو بتایا کہ جسے پھنیر سانپ ڈس لیتا ہے' وہ زندہ نہیں بچتا۔ اسے صرف سپیرے ہی اپنے جنتر منتر سے بچا سکتے ہیں۔ سکندر نے ایسے کئی سپیروں کو اپنی فوج میں شامل کرلیا، جو اس زہر کا توڑ جانتے تھے۔ پوری فوج میں اعلان کر دیا کہ جسے سانپ ڈس لے اسے فوراً ان سپیروں کے پاس پہنچایا جائے۔

اس کے ایک سپہ سالار پیوسس ٹس نے بیان دیا۔ ''میں نے جنگل میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے قد کے آدمی دیکھے ہیں۔ وہ درختوں اور اونچے ٹیلوں پر رہتے ہیں۔ انہوں نے گرمی کے باوجود پوستین پہن رکھی تھی۔ جب ہم ادھر سے گزرنے لگے تو انہوں نے ہم پر سنگ باری شروع کر دی۔''

سکندر کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک سپیرے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ آدمی نہیں بلکہ ہماری جیسی شکل کے بندر ہیں۔ ہم انسانوں کی نقالی کرتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے پہن رکھا ہے' وہ پوستین نہیں ہے۔ بلکہ ان کی جسمانی کھال ہے۔''

سکندر نے آدمیوں کی طرح بولنے والے طوطوں' انسانوں کی نقالی کرنے والے بندروں اور کئی درجن ہاتھیوں کو بھی مقدونیہ بھجوا دیا۔ مقدونوی سپاہی اپنے وطن سے ہزاروں میل دور تھے۔ پچھلے تین برسوں سے اپنی بیوی' بچوں کی صورتیں دیکھنے کو ترس رہے تھے۔ اپنے وطن کی مٹی انہیں پکارتی تھی۔ کتنے ہی مسرتوں بھرے یادگار لمحات اپنی طرف کھینچتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ سکندر اب وہاں سے واپسی کا راستہ اختیار کرے گا۔



لیکن اس نے توقع کے خلاف مشرق کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ فوجیوں کو سمجھایا ''آج نہیں تو کل ہم اپنے وطن واپس جائیں گے۔ مگر دنیا کے آخری سرے کو اپنی مٹھی میں لے کر جائیں گے۔ جس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں' اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھنا چاہئے۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ ہم کتنے عجیب و غریب مشاہدے کر رہے ہیں؟ ایسی گراں قدر معلومات حاصل کر رہے ہیں' جو گھر بیٹھے کبھی حاصل نہیں ہوتیں۔''

راجہ امبھی ایک رہنما کی حیثیت سے سکندر کے ساتھ تھا۔ اس نے بتایا کہ آگے چار بڑے دریا راستے میں آئیں گے۔ ہر دریا کے بعد ہندوستان وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ مقدونوی سپاہی راجہ امبھی سے خوش نہیں تھے۔ کیونکہ وہ آگے اور آگے بڑھنے کے لئے سکندر کے اشتیاق کو بھڑکاتا جا رہا تھا۔

اس کے برعکس سکندر اس راجہ سے بہت خوش تھا۔ اس نے فوج کو حکم دیا تھا کہ اس کے علاقے میں کوئی لوٹ مار نہ کرے۔ رعایا کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا جائے۔ امبھی ایک راجہ تھا۔ سکندر نے اسے ان علاقوں کا مہاراجہ بنا دیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سکندر ہندوستانیوں سے بہت خوش تھا۔ کیونکہ وہ کسی لڑائی اور خون خرابے کے بغیر اس کی اطاعت قبول کر رہے تھے لیکن آگے چل کر ایک دلیر اور بے باک راجہ نے اس کا راستہ روک دیا.... وہ راجہ پورس تھا۔

امبھی دراصل راجہ پورس کا دشمن تھا۔ اس کا باج گزار بن کر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ہی ہم وطن کو نیچا دکھانے کے لئے اس مقدونوی بادشاہ سے اتحاد کیا تھا۔ سکندر کو امید نہیں تھی کہ مقدونوی فوج کے مقابلے پر کوئی راجہ آ سکے گا۔

دریائے جہلم کے اس پار راجہ پورس کی حکومت قائم تھی۔ ان دنوں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس کے لشکر میں کئی سو ہاتھی تھے اور مقدونوی سپاہی نہیں جانتے تھے کہ ان پہاڑ جیسے جانوروں کے آگے کس طرح ٹھہر پائیں گے؟ موسلا دھار بارش کے باعث وہ دریا پر پل بھی نہ بنا سکے۔ دریا کا پانی روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

یوں دیکھا جائے تو مقدونیہ کے تجربہ کار سپاہیوں کے آگے راجہ پورس کچھ بھی نہ تھا۔ ان کی اصل دشمن بے پناہ بارش اور قوی ہیکل ہاتھی تھے۔ ان کے یہ اندازے غلط تھے کہ راجہ پورس کچھ بھی نہیں ہے۔ جبکہ وہی سب کچھ تھا۔ اسے جنگی مہارت حاصل تھی۔ اس نے بڑی حکمت عملی سے دوسرے کنارے پہنچنے کا راستہ روک رکھا تھا۔

سکندر بڑے ہی غلط وقت میں پورس کے مقابلے پر آیا تھا۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور دریا اترنے میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ اس کے گھوڑے ان ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس نے صورت حال کا لینے کے بعد اپنے گھڑ سواروں کو ان مقامات پر بھیج دیا' جہاں دوسرے کنارے پر ہاتھیوں سے مقابلہ نہ تھا۔ پورس نے ادھر گھڑ سواروں کو جاتے دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا۔ سو ہاتھی بہت ہوتے ہیں۔ لیکن ناکہ بندی کے لئے ناکافی تھے۔

سکندر نے دوسری چال چلی۔ پورس کو حیران اور مزید پریشان کرنے کے لئے ہر سمت نقل و حرکت شروع کر دی۔ گھڑ سوار ادھر سے ادھر دوڑتے جاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس قسم کی تیاریاں کرتے پھر رہے ہیں؟ رات کی تاریکی میں سکندر کے سپاہی ایسے جوش و خروش سے نعرے لگاتے تھے' جیسے حملہ کرنے کے لئے پیش قدمی کر چکے ہوں اور اب تب میں دوسرے کنارے پر پہنچنے والے ہوں۔

ان حالات میں پورس کا آرام حرام ہو گیا۔ وہ دن رات ہاتھی پر بیٹھا اپنی فوج کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا تھا اور دشمن کی سرگرمیوں کا اندازہ کرتا رہتا تھا۔ کئی دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ تھک ہار کر اپنے خیمے میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گرد سواروں کو پہریداری کا حکم دیا اور ان کے ذریعہ خبریں حاصل کرتا رہا کہ سکندر کی فوج دوسرے کنارے پر کیا کرتی پھر رہی ہے؟

سکندر نے پھر ایک اور چال چلی۔ اس نے فوج کے ایک بڑے حصے کی کمان سلیوکس کے سپرد کی اور یہ حکم دیا کہ وہ اپنے کیمپ میں الاؤ روشن رکھے اور ایسی سرگرمیاں جاری رکھے' جیسے ادھر سے حملہ ہونے ہی والا ہے۔ جب تک راجہ پورس اپنی جگہ چھوڑ



کر اس کی طرف نہ آئے' تب تک وہ اپنی بے تکی سرگرمیاں جاری رکھے۔

سکندر اور پورس کی یہ جنگ بہت ہی مشہور اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے اس کی تفصیلات بیان کی جا رہی ہیں۔

سکندر نے رات کے وقت دریا عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہفا اسشن' بطلیموس' سلیوکس اور دوسرے سپہ سالاروں کو فوج کے مختلف دستوں کی کمان دی۔ پھر وہ دریا کی بالائی سمت میں اٹھارہ میل دور تک چلا گیا۔ اس نے اپنے اور کیمپ کے درمیان سنتریوں کی ایک زنجیر قائم کر رکھی تھی۔ یہ سنتری بڑی تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پیغامات پہنچاتے رہتے تھے۔

سکندر آگے جا کر جہاں پہنچا' وہاں ایک جزیرہ تھا۔ اس پر کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس جزیرے کے بعد وہ دوسرے کنارے تک پہنچ سکتے تھے۔ لیکن موسم باراں دشمن بنا ہوا تھا۔ اچانک ہی سخت بارش شروع ہو گئی۔ بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک ایسی تھی کہ ایک دوسرے کی آوازیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ لیکن وہ بہت ہی ضدی اور ارادوں کے پکے تھے۔ انہوں نے بڑی جواں مردی اور جاں فشانی سے دریا عبور کر لیا۔

لیکن اس پار پہنچ کر ان کی یہ کامیابی سراب ثابت ہوئی۔ فوج آگے بڑھنے لگی تو رکاوٹیں پیش آنے لگیں۔ تب انہیں پتہ چلا کہ وہ دوسرے کنارے پر نہیں آئے ہیں' بلکہ ایک اور جزیرے پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ ادھر کیچڑ میں دھنسے ہوئے تھے کہ دشمن کے پہریداروں نے انہیں دیکھ لیا۔ ادھر سکندر کے دوسرے معاون دستے آ گئے تھے۔ انہوں نے ایک گھاٹ کا پتہ لگایا پھر کسی طرح دریا پار کر کے وہاں تک پہنچ گئے۔ لیکن اس کنارے کی زمین کیچڑ اور دلدل سے بھری ہوئی تھی۔ اتنی احتیاط اور جانفشانی سے کام لینے کے باوجود سکندر کا منصوبہ درہم برہم ہو رہا تھا۔

وہ کسی طرح اس دلدلی زمین سے باہر نکل رہے تھے' ایسے وقت دشمن کی فوج مقابلے پر آ گئی۔ ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ مقابلے پر آنے والے بھی

دلدل میں دھنسنے لگے۔ انہوں نے سکندر کی پیش قدمی کو روکنے کی بھرپور کوششیں کیں مگر ان کے مقابلے پر یا تو مارے گئے یا پلٹ کر بھاگ گئے۔ سکندر نہیں جانتا تھا کہ پورس کی فوج آگے کیا کر رہی ہے؟

جب آگے جا کر دشمن کا بھاری لشکر مقابلے پر آیا تو سکندر کے ساتھ صرف گھڑ سوار تھے۔ پورس کی فوج کے آگے بکتر بند ہاتھی تھے۔ ہر ہاتھی کے درمیان ایک ایک سو فٹ کا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ زمین پر کھڑے ہوئے تیر اندازوں کے پاس ایسی زبردست کمانیں تھیں کہ تیر چلانے کے لئے ان کمانوں کے نچلے حصوں کو زمین پر رکھنا پڑتا تھا۔ ان تیر اندازوں کے پیچھے نیزہ بردار اور تلوار باز کھڑے ہوئے تھے۔

سکندر دشمن کی اس منظم فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ جہاں تھا' وہیں رک گیا۔ فوراً ہی اپنے سنتریوں کے ذریعہ دوسرے سپہ سالاروں کو فوجی دستوں کے ساتھ وہاں پہنچنے کا حکم دیا۔ کافی وقت گزرنے کے بعد اس کی فوج کے تمام دستے وہاں پہنچ گئے۔ اب اس کے ساتھ ہزاروں سوار اور تیر انداز تھے۔ تب اس نے پیش قدمی کی۔ وہ اپنے گھوڑے بیوسی فالس پر سوار تھا۔ اب تک جتنی جنگیں لڑتا آیا تھا' بیوسی فالس پر سوار رہ کر ہی فتوحات حاصل کرتا رہا تھا۔

کوئی ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ جب گھمسان کا رَن پڑا تو بیوسی فالس تیروں سے زخمی ہو کر اوندھے منہ گر پڑا۔ سکندر نے اپنے اس دیرینہ رفیق کو دیکھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا تھا۔

اس بوڑھے گھوڑے نے سکندر کو فرش سے شہرت کے عرش تک پہنچایا تھا۔ جب وہ کتابوں کا کیڑا تھا اور سپاہیانہ تربیت حاصل کر رہا تھا' تب بیوسی فالس ایک اڑیل گھوڑا تھا' کسی کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ اس نے سکندر کے قابو میں آ کر فیلقوس اور تمام سپہ سالاروں کو حیران کر دیا تھا۔ سکندر کو اسی دن سے ایک گھڑ سوار سپاہی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اسے پہلی کامیابی بیوسی فالس کی پیٹھ پر حاصل ہوئی تھی۔

یہ وہی دیرینہ رفیق تھا' جس نے اسے اپنی پشت پر بٹھا کر اس کی پہلی محبوبہ



سنبوری تک پہنچایا تھا۔ وہ ایسا وفادار تھا کہ ہر جنگ میں سکندر کے ایک ایک اشارے کو سمجھتا تھا۔ اس میں اتنی ہوشیاری آ گئی تھی کہ وہ تلواروں اور نیزوں کے درمیان سے اپنے آقا کو مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے جاتا تھا۔

سکندر نے ہر جنگ میں جتنے زخم کھائے تھے' اتنے ہی زخم وہ بھی کھاتا رہا تھا۔ ایک دو نہیں' پورے سترہ برس تک وہ سکندر کے ساتھ خطرات سے کھیلتا رہا تھا۔ بے چارہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس نے دم توڑتے ہوئے آخری بار اپنے فاتح اعظم کو دیکھا۔ پھر اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بجھ گئیں۔

مقدونوی سپاہی ہندوستانی فوج کو دونوں جانب سے نرغے میں لے چکے تھے۔ اگرچہ وہ گِھر چکے تھے مگر بڑی مردانگی سے لڑ رہے تھے۔ سکندر ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار بازی کے کمالات دکھاتا ہوا ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان گھستا چلا گیا۔

سلیوکس اور بطلیموس اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھاتے جا رہے تھے مگر ہاتھیوں کے مقابلے میں ذرا ٹھٹک جاتے تھے۔ تب انہوں نے مہاوتوں کو نشانہ بنایا۔ یوں وہ ہاتھی اپنے مہاوتوں کے بغیر بھٹکنے لگے۔ جب ان پر تیر برسائے گئے تو وہ پلٹ کر اپنی ہی فوج میں گھستے چلے گئے۔ اپنے ہی سپاہیوں کو روندتے ہوئے اندھا دھند بھاگنے لگے۔

اس حکمت عملی کے باعث بازی پلٹ گئی۔ اپنے ہاتھوں' اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی بات تھی۔ وہ اپنے ہاتھی تھے اور بدحواسی میں اپنوں کو ہی کچلتے جا رہے تھے۔ ان ہاتھیوں سے جو بچ رہے تھے' وہ مقدونوی سپاہیوں کے نیزوں اور تیروں کا نشانہ بن رہے تھے۔ دور دور تک لاشیں ہی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔

بھاگنے والوں میں سب سے آخری شخص راجہ پورس تھا۔ وہ اپنے ہاتھی پر سوار تھا۔ بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ پہاڑ جیسے ہاتھی کے جسم پر بھی جگہ جگہ تیر پیوست ہو گئے تھے۔ سکندر نے راجہ امبھی کے فوجیوں کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ انہیں حکم دیا کہ اسے جان سے نہ مارا جائے۔ اسے اطاعت کرنے پر راضی کر لیا جائے۔

انہوں نے تعاقب کرتے ہوئے راجہ پورس کو گھیر لیا۔ اسے سکندر کا حکم سناتے

ہوئے کہا۔ ''شاہ مقدونیہ نے وعدہ کیا ہے' تُو اس کی اطاعت قبول کرے گا تو تجھے جان کی امان دی جائے گی۔''

راجہ کے تمام سپاہی فرار ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود اس نے سینہ تان کر کہا۔ ''میں سر کٹانا جانتا ہوں' سر جھکانا نہیں جانتا۔ راجہ امبھی ہندوستانی ہو کر اپنے ہی ہم وطنوں پر فوج کشی کرا رہا ہے۔ ہمارا جوتا ہمیں کاٹ کر سر پر بیٹھنا چاہتا ہے۔''

ایسے وقت سکندر راجہ امبھی کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ پورس نے حقارت سے راجہ امبھی کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''تجھ جیسے بے غیرت ہندوستانی کو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہئے۔''

وہ ہاتھی سے اتر کر نیچے آیا۔ سکندر بھی گھوڑے سے اتر گیا۔ راجہ امبھی نے کہا۔ ''یہ مجھے بے غیرت ہندوستانی کہہ رہا ہے' یعنی تیری اطاعت سے انکار کر رہا ہے۔''

سکندر اس کے قد و قامت سے اور شاہانہ انداز سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک افسر کو حکم دیا کہ پورس کو پانی پلایا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ پورس کے آگے پانی پیش کیا گیا۔ اس نے پینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں فاتح نہیں ہوں اور خود کو شکست خوردہ بھی نہیں سمجھتا۔ موجودہ حالات میں پہلے اپنی حیثیت معلوم کروں گا۔ پھر پانی پیئوں گا۔''

سکندر نے کہا۔ ''تُو بادشاہ ہے اور ایک بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔''

تب پورس نے پانی پی کر ایک گہری سانس کھینچی۔ سکندر نے پوچھا۔ ''اب بتا.... تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

پورس نے سینہ تان کر کہا۔ ''وہی سلوک، جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔''

سکندر اور پورس کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ افسانوی انداز میں مشہور ہو چکا ہے۔ دنیا کی تمام تاریخی کتب میں فاتح اور مفتوح کے درمیان ہونے والی یہ باتیں موجود ہیں۔



سکندر اس کے جواب سے بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا۔ ''میں اطاعت کرنے والوں اور سر جھکانے والوں سے ہاتھ نہیں ملاتا۔''

اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم دوست بن کر امن و امان سے رہ سکتے ہیں۔ تُو میری اطاعت کئے بغیر اپنے علاقوں کا حکمران رہے گا۔''

پورس نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تُو واقعی فاتح اعظم ہے۔ صرف ملکوں کو ہی نہیں' دلوں کو بھی جیتنا جانتا ہے۔''

سکندر کھلے دل اور وسیع ذہن کا مالک تھا۔ تلوار سے کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اپنے حُسنِ سلوک سے دشمنوں کو جیت لیتا تھا۔ اسے ناکامی اور پسپائی سے نفرت تھی۔ جب کامیابی اور فتح مندی حاصل کرتا تو اس میں ایک ذرا تکبر پیدا نہ ہوتا۔ وہ چاہتا تو راجہ پورس کو قتل کر کے اس کے تمام علاقوں پر قبضہ جما لیتا لیکن اس نے مفتوح راجہ اور اس کی رعایا کے دلوں پر قبضہ جمایا تاکہ وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کے سلسلے میں اس کے مددگار و معاون بنتے رہیں۔

اس نے اپنی حکمت عملی کے مطابق جہلم سے دریائے بیاس تک اڑتیس پہاڑی شہروں کو فتح کیا لیکن مقدونوی فوج اب تھک چکی تھی۔ مسلسل جنگجوئی سے بیزار ہو گئی تھی۔ آگے اور آگے پہاڑی سلسلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سکندر کا خیال تھا کہ سمتیں بدل کر جنوب مشرق کی طرف جائے گا تو ہندوستان کے مزید کئی علاقوں کو فتح کر سکے گا۔ مگر سپاہی آگے جانے کو تیار نہیں تھے۔

سپہ سالاروں اور کمانداروں نے سکندر سے کہا۔ ''سپاہی پوچھتے ہیں' یہ جنگ و جدل' یہ خون خرابہ کہاں جا کر ختم ہوگا؟ اس کی کوئی حد ہونی چاہئے۔''

سکندر نے کہا۔ ''دلیر سپاہی کبھی تھک کر نہیں بیٹھتے' ہاتھ سے تلوار نہیں چھوڑتے۔ ان کے آگے زمین کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سپاہی پوچھتے ہیں' جنگ کب ختم ہوگی' کہاں جا کر ختم ہوگی؟ تو میں وعدہ کرتا ہوں' یہاں سے کچھ فاصلے پر دریائے گنگا بہتا ہے۔ اس سے ذرا آگے مشرقی سمندر ہے' بس وہاں پہنچ کر ہم دم لیں گے اور اپنے تمام مفتوح

علاقوں کو منظم کریں گے۔ یہاں حکمران بن کر رہیں گے۔ جو سپاہی مقدونیہ واپس جانا چاہے گا' جا سکے گا۔"

سکندر نے اپنے تصور کے مطابق ہندوستان کا نقشہ پیش کیا تھا کہ دریا گنگا کے آگے انہیں سمندر ملے گا اور وہ وہاں سے لوٹ آئیں گے۔ اس نے تمام سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری دلیری' جانبازی اور استقلال کی بدولت ہم نے اب تک بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ تم سب زخمی ہو جاتے ہو' بیمار ہو جاتے ہو' تمہیں اپنا گھر' اپنے بیوی بچے یاد آتے ہیں۔ میرا بھی گھر ہے' میری بھی ماں ہے۔ اگرچہ بیوی ساتھ ہے' لیکن میں ایک ازدواجی' گھریلو اور آرام دہ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ پچھلے تمام علاقوں کو فتح کرنے کے بعد جو بھی مال غنیمت ہاتھ آتا رہا' وہ تم لوگوں میں تقسیم کرتا رہا۔

میرے ساتھ آگے بڑھو۔ جب لوٹو گے' گھر جاؤ گے تو تم سب دولتمند سپاہی کہلاؤ گے۔"

اسے امید تھی کہ تمام سپاہی اس کی بات مان لیں گے۔ آگے بڑھنے پر راضی ہو جائیں گے لیکن وہ ہزاروں میل سے جنگیں لڑتے آئے تھے' زخموں سے چُور تھے۔ ان کی آدھی جان نکل چکی تھی۔ کوئی بھی آگے بڑھنے کو راضی نہ ہوا۔ بے چارے پچھلے آٹھ برسوں سے جنگیں لڑتے آ رہے تھے۔ سکندر کو مجبوراً واپسی کا سفر شروع کرنا پڑا۔

وہ سلیوکس کو ان علاقوں کو منتظم اعلیٰ بنا کر گویا اپنا قائم مقام حکمران بنا کر وہاں سے لوٹ گیا۔ تمام سپاہی خوشی سے ناچ رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ سکندر ان کی خوشیوں میں شریک نہیں تھا۔ ایک تو وہ جبراً واپس جا رہا تھا' دوسرا یہ کہ آخری جنگ لڑتے وقت ایک تیر اس کے پھیپھڑے میں آ لگا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ہندوستانی وید اور یونانی حکیم سفر کے دوران اس کا علاج کرتے جا رہے تھے۔

صرف وہی نہیں' دوسرے ہزاروں سپاہی بھی زخمی تھے۔ ان کی رفتار اتنی سست تھی



کہ کئی مہینوں بعد ایک ہزار میل کا سفر طے کیا گیا۔ سکندر کے زخم بھرتے جا رہے تھے۔ وہ کبھی پیدل چلتا تھا' کبھی گھوڑے پر سواری کرتا تھا۔ وطن واپس لوٹنے کی خوشی ایسی تھی کہ سپاہی صرف دواؤں سے ہی نہیں اپنی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی سے بھی صحت یاب ہو رہے تھے۔

سکندر کی فوج میں تھیسز کے ریاضی دان' بابل کے ستارہ شناس اور مجوسی موجود تھے۔ علاج کرنے والے اور غیب کی باتیں بتانے والے ہندوستانی جوگی بھی تھے۔ ان میں سے ایک جوگی کو کیلی ناس کہا جاتا تھا۔

کیلی ناس بہت بوڑھا تھا۔ اس کے پاس کھانے کے ایک برتن اور چٹائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ سکندر اسے سہولتیں پیش کرتا تھا مگر وہ انہیں قبول نہیں کرتا تھا۔ بھوک لگتی تو برتن سامنے رکھ لیتا تھا۔ اس میں کھانا ڈالا جاتا تو چپ چاپ کھا لیتا تھا۔ وہ صرف سکندر سے کبھی کبھی باتیں کرتا تھا۔ ورنہ تنہائی میں وقت گزارتا تھا۔

سچ بولتے وقت سکندر کا بھی خیال نہیں کرتا تھا۔ اس سے کہتا تھا۔ "تُو نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور جتنا حاصل کیا ہے' اس سے زیادہ تباہی اور بربادی کا سامان کیا ہے۔ دیکھ...! تُو نے کیا پہن رکھا ہے؟ کیا یہ لباس ہے....نہیں تُو نے سر سے پاؤں تک زخموں کا لباس پہن رکھا ہے۔ اپنے متعلق ڈرتا رہا کر... یاد رکھ! یہ ہتھیار' یہ دولت' یہ مال غنیمت کے طور پر لایا ہوا سامان اور جانور تجھے زندگی کی ایک سانس بھی نہیں دے سکیں گے۔ جیسے ہی وقت پورا ہوگا' تُو دنیا سے آنکھیں بند کر لے گا۔"

وہ ہمیشہ بدشگونی کی باتیں کرتا تھا۔ مگر سچ بولتا تھا۔ سکندر نے اسے ایک مشیر کا درجہ دیا تھا۔ کئی معاملات میں اس سے مشورے لیتا رہتا تھا۔ ایک بار سکندر نے اس سے پوچھا۔ "تُو تنہائی پسند ہے' گوشہ نشین رہتا ہے۔ پھر میرے ساتھ کیوں آیا ہے؟"

کیلی ناس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "تُو یہ بتا' ہندوستان کیوں آیا تھا؟ مقدونیہ تک محدود کیوں نہ رہا؟ ....نہیں۔ ہم تم اپنی مرضی سے کہیں ٹھہر نہیں سکتے۔ ہر لحہ اپنی موت کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ میں بھی اپنی موت کی منزل

تک پہنچنے کے لئے تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔"

یونانی فلسفی کہتے تھے' وہ جوگی تقدیر کا نظریہ پیش کرتا رہتا ہے۔ بے شک' ہم سب ہر لمحہ اپنی موت کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ خالی ہاتھ آتے ہیں اور خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ ایک مقام پر سکندر نے شہنشاہ ایران کروش کا مقبرہ دیکھا۔ اسے چاروں طرف سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے دریافت کیا۔ "اسے کیوں اس طرح بند کیا گیا ہے؟"

ایک شخص نے بتایا۔ "اب یہاں پہرہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ مقبرے میں جو قیمتی چیزیں تھیں' وہ سب چرالی گئی ہیں۔ چند معمولی چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔"

سکندر کے حکم سے اس مقبرے کو کھولا گیا۔ اس نے اندر آ کر دیکھا۔ اصل تابوت خالص سونے کا تھا اور اس پر قیمتی تحفے رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ چور اٹھا کر لے گئے تھے۔ صرف کوروش کی لاش رہ گئی تھی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔

"مجھے بعد از مرگ دیکھنے والے میں کوروش ہوں۔
میں نے ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی اور ایشیا کو بہت
بڑی مملکت بنا دیا۔ تُو یہاں دبے قدموں آ اور دبے
قدموں جا... میرے آرام میں خلل نہ ڈال...."

انسان کتنا احمق ہے؟ سونے کے تابوت میں لیٹ کر یہ سمجھتا ہے کہ چور خلل ڈالنے نہیں آئیں گے۔ وہ جو ابرو کے ایک اشارے سے چوروں کے ہاتھ کاٹ ڈالتا تھا' زندگی کو موت میں بدل ڈالتا تھا۔ وہ موت کی نیند سے جاگ کر کسی چور کا ہاتھ نہ پکڑ سکا۔ لوٹنے والے اسے کنگال بنا کر سارا مال لے گئے تھے۔

مقبرے کا پاس مقامی باشندے جمع ہو گئے تھے۔ چند بوڑھے سکندر کے پاس آئے۔ انہوں سفید لباس پر سرخ رنگ کے پٹکے باندھ رکھے تھے۔ اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ سکندر نے پوچھا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواباً کہا۔



"شہنشاہ کروش کا کوئی جاں نشین نہیں تھا۔ تُو یہاں آیا ہے تو پھر تُو ہی جاں نشین ہے۔ بادشاہت کا یہ سلسلہ نیاگاں کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اے خوش نصیب...! یہ منصب کسی کو نہیں ملتا۔ جو نالائق ہوتے ہیں' ان تک وراثت نہیں پہنچتی۔ بادشاہت کو قبول کرتے وقت یہ یاد رکھ... بہت سے بادشاہ اپنی عظمت اور رعب و دبدبے کے ساتھ گزر چکے ہیں، کسی کے نام یاد رہ گئے' کسی کے نام یاد نہ رہے۔

ایک دن تجھے بھی گزر جانا ہے۔ یاد رکھ... دو طرح کے بادشاہوں کے نام زندہ رہتے ہیں۔ ایک وہ جو بہت نیک اور مہربان ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ، جو سراسر شیطان ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے عبرتناک افسانے چھوڑ جاتے ہیں۔"

سکندر ان کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔ ان کے چہروں پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، وہ دل میں اتر جانے والی باتیں کر رہے تھے۔ وہ پتوں میں لپٹی ہوئی انجیریں اور چاندی کے پیالوں میں چھاچھ لے کر آئے تھے۔ اسے کھانے پینے کے لئے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے پہلے خود کھایا۔ تا کہ کسی قسم کا شبہ نہ رہے۔ سکندر نے ان کا دل رکھنے کے لئے انجیریں کھائیں اور چاندی کے پیالے سے چھاچھ پی کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

بوڑھا جوگی کیلی ناس بہت ہی کمزور ہو چکا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ اس نے سکندر سے کہا۔ "میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ مجھے میری چتا میں جلایا جائے۔"

سکندر نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تُو زندہ جل جانا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔ میں اپنے مقدر کی بات جانتا ہوں۔ مجھے آگ میں جل کر مرنا ہے۔ دوسرے ہندو مرنے کے بعد جلتے ہیں، میں جلنے کے بعد مروں گا۔"

سکندر اس کی یہ خواہش پوری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سمجھایا کہ اسے خود کشی نہیں کرنی چاہئے۔ کیلی ناس نے پوچھا۔ "تُو مجھے کیوں روک رہا ہے؟ کیا تُو نے اپنا

گھر' اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے گھروں اور دوسرے ملکوں کے لوگوں کو قتل نہیں کیا؟ کیا تُو نہیں جانتا' کئی عورتوں اور مردوں نے تیرے ہاتھوں مرنے کے بجائے خودکشی کو ترجیح دی؟ میں اگر خودکشی کر رہا ہوں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تجھے اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔"

سکندر خاموش رہا۔ اس کے لئے لکڑیوں کی چتا بنائی گئی۔ وہ اس پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب جلنے لگا تو آخری لمحات میں بولا۔ "اے سکندر...! تُو نے روئے زمین کو تہ و بالا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ زمین کے چپے چپے پر اپنی فتوحات کے نشان چھوڑتا گیا لیکن تُو اتنی ہی زمین کا مالک ہے' جتنی مرنے والوں کو ملا کرتی ہے۔"

اس کے بعد وہ خاموشی سے جل کر مر گیا۔ جب وہ جل رہا تھا تو سکندر نے حکم دیا کہ اس کی چتا کے چاروں طرف زور زور سے باجے بجائے جائیں۔ مہاوتوں کو حکم دیا کہ ان کے ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے اسے سلامی دیں۔ وہ ہندوستانی جوگی جانتا تھا کہ اسے اسی مقام پر آکر جل کر مرنا ہے۔ اس کا علم' اس کا گیان' اس کی خودکشی' اس کی مردانگی احترام کی مستحق تھی۔ سکندر نے اپنی پوری فوج کے ساتھ اسے سلام کیا اور حکم دیا کہ اس جوگی کی تمام باتیں لکھ کر رکھی جائیں۔ یہ ہمارے لئے ہدایات کے طور پر مشعلِ راہ ہوں گی۔

روشنک نے اس کے لئے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ چونکہ وہ جگہ جگہ رکتا جا رہا تھا۔ مفتوح علاقوں میں حکومتی امور کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنے نائب حکمران مقرر کرتا جا رہا تھا۔ اس لئے آگے بڑھنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ روشنک بچے کے ساتھ طویل سفر کی حالت میں رہے۔ اس نے انہیں ایک آرام دہ پالکی میں بٹھا کر ایک حفاظتی دستے کے ساتھ مقدونیہ بھیج دیا۔

اس نے اینٹی پیٹر کو مقدونیہ کا نائب حکمران بنایا تھا۔ لیکن اولمپیاس سے اس کی بنتی نہیں تھی۔ وہ اکثر قاصدوں کے ذریعہ بیٹے کو پیغام بھیجتی رہتی تھی' شکایتیں کرتی رہتی تھی۔ "یہ تُو نے کسے حکمران بنا کر مجھ پر مسلط کر دیا ہے؟ اس نے میرے اختیارات



محدود کر دیئے ہیں۔ حکومتی معاملات میں مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

سکندر سمجھتا تھا کہ عورتوں کو حکومتی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے اور اولمپیاس تو فیلقوس جیسے بادشاہ کے زمانے سے حکومت کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتی آئی تھی۔

سکندر اس کی شکایتیں سنتا تھا۔ پھر جوابی پیغام کے ذریعہ اسے سمجھاتا تھا۔ یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا۔ "میں نے اینٹی پیٹر کو تنبیہ کی ہے۔ میری ماں ہونے کے ناطے تیرے جو اختیارات ہیں' انہیں برقرار رکھا جائے گا۔ میں جلد ہی واپس آکر خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لوں گا۔"

اینٹی پیٹر بھی شکایات کے دفتر کھولتا رہتا تھا۔ اپنے قاصد کے ذریعہ پریشانیاں ظاہر کرتا تھا۔ "تیری ماں نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ایک عورت بھلا فوجی اور شہری معاملات کو کیا سمجھ سکتی ہے؟ مگر وہ سمجھے یا نہ سمجھے' میرے ہر حکم پر نکتہ چینی کرتی رہتی ہے۔ اس کی ایک ہی ضد ہے کہ کوئی بھی حکم صادر کرنے سے پہلے اس کی منظوری لی جائے۔"

سکندر ان سے ہزاروں میل دور رہ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے' دشمنوں سے نمٹتے ہوئے ان دونوں کے درمیان صلح صفائی نہیں کرا سکتا تھا۔ بس کسی طرح انہیں ٹالتا رہتا تھا۔

پھر اولمپیاس نے لکھ بھیجا۔ "اب تو حد ہو چکی ہے۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ میں اپنی ذلت برداشت نہیں کروں گی۔ اس نے بھرے دربار میں میری توہین کی ہے۔ تُو اپنے مخبر بھیج کر معلوم کر سکتا ہے کہ اینٹی پیٹر مجھ پر کیسے مظالم ڈھا رہا ہے؟ اس نے محل کے اندر بھی میرے اختیارات ختم کر دیئے ہیں۔ تُو نے اسے نائب بنا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ مطلق العنان بادشاہ بن چکا ہے۔"

ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ بادشاہت کے معاملے میں باپ بیٹے پر اور بھائی بھائی پر بھروسہ نہیں کرتا ہے۔ جسے بھی تخت پر بیٹھنے کا موقع ملتا ہے' وہ پوری سلطنت پر قبضہ جما

لیتا ہے۔ اینٹی پیٹر سے خون کوئی رشتہ نہیں تھا۔ نہ وہ باپ تھا' نہ بھائی تھا اور نہ بیٹا... سکندر نے سوچا۔ ''شاید میں غلطی کر رہا ہوں۔ مجھے اس معاملے کی تحقیقات کرنی چاہئیں۔''

اس نے قاصد سے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ اینٹی پیٹر نے میری ماں کے اختیارات کم کر دیئے ہیں اور اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے؟''

قاصد نے ڈرتے ہوئے کہا۔ ''میں سچ کہوں گا تو ادھر اینٹی پیٹر میری گردن اڑا دے گا۔ جھوٹ بولوں گا تو تُو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''میں تجھے جان کی امان دیتا ہوں، یہ بات اینٹی پیٹر تک نہیں پہنچے گی۔ تُو سچ سچ بتا' حقیقت کیا ہے؟''

قاصد نے اولمپیاس کی حمایت میں بیان دیا اور کہا۔ ''اینٹی پیٹر نے اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا۔ لیکن اس کی خودسری اور اس کا غرور بتا رہا ہے کہ جلد ہی اعلان کرنے والا ہے۔''

سکندر مقدونیہ میں اپنی چھوٹی سی فوج چھوڑ آیا تھا۔ اس کے سپہ سالار اور دستوں کے کماندار قابل اعتماد تھے۔ اس نے تحریری احکامات جاری کئے۔ ان فوجی افسروں کو حکم دیا۔ ''اینٹی پیٹر کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیا جائے۔ پھر میری ماں جسے چاہتی ہے' اسے نائب حکمران بنا دیا جائے۔''

مقدونیہ میں اس کے احکامات کی تعمیل کی گئی۔ ایک ماہ کے اندر ہی اینٹی پیٹر کا جوان بیٹا کیسنڈر گھوڑا دوڑاتا ہوا سکندر کے پاس آیا۔ پھر اس کے قدموں میں جھک کر بولا۔ ''تیرے سر پر ہمیشہ دیوتاؤں کا سایہ رہے۔ میرے باپ کے خلاف تیرے کان بھرے گئے ہیں۔ اس نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا' جس کے باعث اسے اس کے عہدے سے معزول کیا جائے۔ یہ بہت ہی سخت سزا ہے کہ ایک قابل شخص کو حبس بے جا میں رکھا جا رہا ہے۔''

سکندر نے کہا۔ ''بے شک۔ اسے نائب حکمران کے عہدے سے معزول کیا گیا



ہے۔ لیکن میں نے اسے حبس بے جا میں رکھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا' میری غیر موجودگی میں کوئی برسوں تک نائب حکمران بن کر رہے۔ اسی لئے یہ نئی تبدیلی کی گئی ہے۔ میں تحریری احکامات بھیج رہا ہوں۔ ان احکامات کی رُو سے تیرے باپ کو آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ چاہے تو یہاں آ کر میرے مشیرِ خاص کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔''

کیسنڈر چاہتا تھا کہ اس کے باپ کو نائب حکمران کی حیثیت سے بحال کیا جائے۔ اس نے کہا۔ ''میرے باپ کے خلاف جھوٹے الزامات ہیں۔ وہ مطلق العنان بادشاہ بننا نہیں چاہتا۔ تیرا تابعدار ہے، تابعدار ہی رہے گا۔ اس نے کبھی تیرے خلاف بغاوت کرنے کا تصور بھی نہیں کیا ہے۔''

سکندر نے کہا۔ ''زیادہ باتیں نہ کر۔ میں کہہ چکا ہوں' میری غیر موجودگی میں وہاں حکمران بدلتے رہیں گے۔ آج دوسرا آیا ہے' کل تیسرا آئے گا۔ میں کسی کو مقدونیہ کا مستقل حکمران بن کر رہنے نہیں دوں گا۔ جا.... یہاں سے دفع ہو جا....''

وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا۔ اسے پورا انصاف نہیں ملا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ باپ اب قیدی بن کر نہیں رہے گا۔ کھلی فضاؤں میں آزاد رہ کر فیصلہ کرے گا کہ اسے مقدونیہ کو خیر باد کہہ دینا چاہئے یا سکندر کا مشیر خاص بن کر رہنا چاہئے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہو سکا۔ اینٹی پیٹر کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اولمپیاس نے اسے قیدی بنانے کے بعد گن گن کر بدلے لئے تھے۔ وہ بے چارہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ عقوبت خانے کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکا۔ اس نے وہیں قید خانے میں دم توڑ دیا۔

سکندر نے اسے رہائی دے کر آدھا انصاف کرنا چاہا تھا۔ لیکن اولمپیاس نے اس ادھورے انصاف کی بھی مٹی پلید کر دی۔ کیسنڈر غصے سے تلملانے لگا۔ اولمپیاس بہت بااختیار اور طاقتور تھی۔ وہ اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ لیکن بغاوت کر سکتا تھا۔

وہ اہل مقدونیہ کو اینٹی پیٹر کی وفاداریاں یاد دلانے لگا۔ ان سے کہنے لگا۔ ''یاد کرو' اتنا اچھا نائب حکمران کبھی تم نے دیکھا تھا؟ اس نے اپنی رعایا کے کسی غریب سے غریب آدمی کو کبھی بھوکا سونے نہیں دیا۔ کبھی کسی کی بہن اور بیٹی پر ظلم ہونے نہیں دیا۔

تم راتوں کو دروازے کھلے رکھتے تھے۔ کوئی چور کوئی دشمن تمہارے گھروں میں گھسنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ آج دیکھو کہ اولمپیاس کے پروردہ سپاہی دکانداروں اور تاجروں سے رشوتیں لیتے پھرتے ہیں۔ جب سے حکمران تبدیل ہوا ہے' تب سے کتنی ہی بہنوں اور بیٹیوں کو اغوا کیا جا چکا ہے۔"

وہ جگہ جگہ تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ "اولمپیاس کو کون نہیں جانتا؟ وہ سانپوں سے کھیلنے والی زہریلی عورت ہے۔ موجودہ حکمران کے سر پر سوار ہو کر حکومت کر رہی ہے اور تم سب کی زندگی میں زہر گھول رہی ہے۔"

کیسنڈر کی باتوں میں وزن تھا' ٹھوس دلائل تھے۔ سب ہی قائل ہو رہے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں جو سپاہی پچھلے آٹھ برسوں سے سکندر کے ساتھ گئے ہوئے تھے' ان کی مائیں' بہنیں اور بیویاں ان کے انتظار میں یا تو مر گئی تھیں یا بوڑھی ہوتی جا رہی تھیں۔

کیسنڈر ان کی محبتوں اور محرومیوں کو بھی بھڑکاتا تھا۔ کہتا تھا۔ "ان میں سے شاید آدھے سپاہی بھی واپس نہ آ سکیں۔ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے ملک کو فتح کرنے کی ہوس میں یہاں بیویاں بیوہ ہو رہی ہیں اور مائیں اپنے بیٹوں سے محروم ہوتی جا رہی ہیں۔ باپ بوڑھے ہو گئے ہیں، بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ یہ لوگ لام سے واپس آنے والے بیٹوں کو شاید پہچان بھی نہیں پائیں گے۔"

وہ ایسے مدلّل انداز میں اپنی بغاوت کی مہم کو تیز کر رہا تھا کہ سب ہی موجودہ حکومت کے خلاف ہو گئے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ شاہ مقدونیہ کو اپنی فوج کے ساتھ واپس آ جانا چاہئے۔

سکندر کو ایک دن لوٹ کر آنا تھا۔ آخر آ ہی گیا۔ جب وہ اپنے بچے کھچے فوجیوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوا تو شاہی محل میں شادیانے بج رہے تھے۔ اولمپیاس بیٹے کا استقبال کرنے کے لئے جشن منا رہی تھی۔ اس نے حکم دیا تھا کہ پورے شہر کو دلہن کی طرح سجایا جائے اور رات کو چراغاں کیا جائے۔



لیکن رعایا بجھے ہوئے دل سے خوشیوں کا اظہار کر رہی تھی کیونکہ وہاں سے جانے والے ہزاروں سپاہی مارے گئے تھے۔ ان کے گھروں میں ماتم ہو رہا تھا، جو زندہ بچ کر آئے تھے' وہ اپاہج ہو گئے تھے۔ لڑائی کے دوران کسی کے ہاتھ کٹ گئے تھے۔ کوئی اپنی ٹانگ سے محروم ہو گیا تھا۔ کتنے ہی ایسے تھے' جو زخم پر زخم کھاتے رہنے کے باعث بیمار اور کمزور ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے۔

سکندر کے آتے ہی کیسنڈر فرار ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ سکندر نے بڑی مشکلوں سے باغیوں پر قابو پایا۔ جن کے بیٹے اور شوہر کھپ گئے تھے۔ انہیں مال غنیمت میں سے اتنی دولت دی کہ انہیں چپ لگ گئی۔ زخموں پر مرہم لگا دیا گیا۔ بیمار اور کمزور سپاہیوں کو بھی ایسے روزگار مہیا کئے کہ وہ گھر بیٹھے بڑی آسودگی سے زندگی گزارنے لگے۔

اس کا مقتول باپ فیلقوس بھی دوستوں' دشمنوں اور پوری رعایا کا دل جیتنے کے لئے وقت اور حالات کے مطابق طریق کار اختیار کرتا تھا۔ سکندر بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے دل جیت رہا تھا۔ انہیں مطمئن کرنے کے لئے اپنی ماں اولمپیاس کے اختیارات بہت کم کر دیئے تھے۔ اس کے سر چڑھے سپاہیوں نے جو مظالم ڈھائے تھے' انہیں سب کے سامنے قتل کرا دیا۔ وہ فاتح اعظم بدلتے ہوئے اور بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانا خوب جانتا تھا۔

پچھلے آٹھ برسوں سے جنگ و جدل میں مصروف رہنے کے بعد واپس آ کر بھی وہ آرام و سکون سے نہ رہ سکا۔ کتنے ہی مسائل اسے الجھاتے رہے اور وہ انہیں سلجھاتا رہا۔ یوں کہنا چاہئے کہ زندگی نے اسے تھکا مارا تھا۔ پھر وہ ایسا بیمار پڑا کہ بستر کا ہو کر رہ گیا۔ مؤرخین میں سے ایک مؤرخ آریاں لکھتا ہے.....

> "اسے رات کے وقت تیز بخار ہوا۔ اس نے معمول کے مطابق دیوتاؤں کے نام سے قربانی کی۔ قربانی کے بعد وہ بخار کی شدت سے خاموش نہ رہ سکا' بڑبڑانے لگا۔ کچھ ہوش مندی کی اور کچھ بدحواسی کی

باتیں کرنے لگا۔

تیسرے دن وہ اور کمزور ہو گیا۔ قربانی کے لئے اسے پالکی میں بٹھا کر لایا گیا۔ پھر اسی حالت میں واپس لے جایا گیا۔ جرنیل اور دیوانی کے افسر محل کے دروازے پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

جب وہ لوگ اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ انہیں پہچان نہیں پا رہا تھا اور بول بھی نہیں سکتا تھا۔ دو دنوں اور دو راتوں میں بخار تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

سپاہیوں کو یہ خبر ملی تو خیال پیدا ہوا کہ سکندر کہیں مر نہ گیا ہوں۔ اور رازدار افسران اس حقیقت کو چھپا رہے ہوں۔ ان میں سے بعض محل میں پہنچے۔ وہ سب سکندر کے وفادار تھے، رو رہے تھے اور زبردستی اس کے کمرے میں گھس آئے تھے۔ وہ بول نہیں سکتا تھا البتہ دائیں ہاتھ سے ان کے سلام کا جواب دے رہا تھا۔ بمشکل اپنا سر اٹھاتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ عالم بقا کو سدھارا۔ صرف بتیس سال اور آٹھ مہینے کی عمر پائی۔''

جب اس کی تدفین ہو رہی تھی تو مصاحب خاص اس ہندوستانی جوگی کو یاد کر رہے تھے' جس نے چتا میں جلتے وقت کہا تھا۔ ''تو دنیا کے آخری سرے تک فتوحات کے جھنڈے گاڑتا چلا جا لیکن تیرے مقدر میں صرف اتنی ہی زمین ہے' جتنی ہر مرنے والے کو ملتی ہے۔''

اس کی موت کے بعد کیسنڈر نے پھر بغاوت کے شعلے بھڑکائے۔ فوج کے کتنے ہی سپہ سالاروں نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ اینٹی پیٹر کا بیٹا انتقام کی آگ میں جلتا آ رہا تھا۔ اس کے باپ کو حبسِ بے جا میں رکھ کر اسے اذیتیں دے کر مارا گیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ شاہی خاندان کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دے گا۔

قسم کھانے کے باوجود اولمپیاس کا رعب اور دبدبہ اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ جب وہ مسلح باغیوں کے ساتھ محل میں داخل ہوا تو اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ وہ



سمجھ رہا تھا کہ کتنی خطرناک عورت کے محل میں داخل ہو رہا ہے؟ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''محل کے اندر چاروں طرف پھیل جاؤ۔ اس زہریلی ناگن کو کسی بل سے بھی نکل کر نہ جانے دو۔''

اولمپیاس اپنی بہو اور ننھے پوتے کے ساتھ خوابگاہ میں تھی، اس کے لئے خطرات سے کھیلنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی خوابگاہ کا ایک چور دروازہ کھولتے ہوئے بہو سے کہا۔

''روشنک! میرے پوتے کو اٹھا اور فوراً یہاں سے نکل جا۔ یہ چور دروازہ تجھے ایک سرنگ سے گزارتے ہوئے شہر سے باہر ایک شاہی اصطبل میں پہنچا دے گا۔''

وہ بولی۔ ''مقدونیہ کا ہر علاقہ میرے لئے انجانا ہے۔ میں تیری رہنمائی کے بغیر جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہوں گی؟ تُو بھی میرے ساتھ چل۔''

''میں تجھے تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ میرا پوتا میرے سکندر کا جانشین ہے۔ میں اسے یہاں کا حکمران بنانے کے لئے جی جان سے حفاظت کرتی رہوں گی۔ اس کے ساتھ لگی رہوں گی۔ تُو آگے چل... میں پیچھے آ رہی ہوں۔''

وہ بہو اور پوتے کو رخصت کر کے اس کمرے میں آئی' جہاں زہریلے سانپوں کے بے شمار پٹارے رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک پٹارے کو لے کر خوابگاہ میں آتی رہی اور ایک ایک سانپ کو دروازے اور کھڑکیوں سے باہر آزاد چھوڑتی رہی۔ کیسنڈر کے سپاہی ادھر آ رہے تھے۔ سانپوں کو دیکھتے ہی بدک گئے۔ چیخیں مار کر پیچھے جاتے ہوئے بولے۔ ''کیسنڈر...! اس ناگن کی خوابگاہ میں سانپ ہی سانپ ہیں، وہ ہمارے قابو میں نہیں آئے گی۔''

کیسنڈر نے کہا۔ ''ڈرتے کیوں ہو؟ سانپوں کے قریب نہ جاؤ، انہیں دور سے ہلاک کرو، پھر اس سپیرن کو قابو میں کرو۔''

وہ دور ہی دور سے تیر چلا کر ان سانپوں کو مارنے لگے۔ وہ بڑی تیزی سے بل کھاتے ہوئے ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے مارے جا رہے تھے۔

جب وہ سب ہی مارے گئے تو کیسنڈر نے دروازے پر لات مارتے ہوئے کہا۔
"زہریلی ناگن...! باہر آجا... تیرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ تُو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہو کو اور سکندر کے جاں نشین کو اسی طرح مرتے دیکھے گی' جس طرح تُو نے اذیتیں دے دے کر میرے باپ کو مارا تھا۔"

خواب گاہ کا دروازہ بہت مضبوط تھا۔ اسے کھولا جا سکتا تھا' توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ جب وہ خود بخود کھلتا چلا گیا تو کیسنڈر ایکدم سے سہم کر سپاہیوں کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر اولمپیاس کھڑی ہوئی تھی۔ جان کی بازی لگانے والے سپاہیوں میں سے کسی کی جرأت نہ ہو سکی کہ کوئی آگے بڑھ کر سانپوں کی ملکہ کو ہاتھ بھی لگاتا۔

اس کی گردن سے ایک سانپ لپٹا ہوا تھا۔ کمر سے' شانوں سے' دونوں ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں سے سانپ ہی سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ وہ دروازے سے باہر آئی تو سب ہی اس سے دور دور ہونے لگے۔ کیسنڈر نے کہا۔ "تُو کیا سمجھتی ہے' یہ بازی گری دکھا کر ہمیں خوفزدہ کرے گی اور اپنی جان بچالے گی؟"

بے شک وہ انہیں خوفزدہ کرنا چاہتی تھی، یوں وقت ضائع کرتے ہوئے اپنی بہو اور پوتے کو جانی دشمنوں سے دور نکل جانے کا موقع دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔
"میرا پوتا تاج وتخت کا حقدار ہے۔ میرے جیتے جی تم لوگ اس جاں نشین کے سائے تک بھی نہیں پہنچ پاؤ گے۔ مجھ سے سمجھوتہ کرو۔ میرے پوتے کے جوان ہونے تک ہم مل جل کر یہاں حکومت کریں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کیسنڈر نے ایک نیزہ کھینچ کر مارا۔ نیزے کی انّی ایک سانپ کے آر پار ہوتی ہوئی اس کے ایک شانے میں پیوست ہوگئی۔ ایک طرف سے تیر آیا۔ وہ دوسرے سانپ کے آر پار ہوتا ہوا اس کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ پھر چاروں طرف سے تیر برسنے لگے۔ وہ چیخ رہی تھی' تکلیف سے کراہ رہی تھی، جسم سے لپٹے ہوئے سانپ مرتے جا رہے تھے۔ آخر وہ بے دم ہو کر فرش پر گر پڑی۔



وہ بڑی سخت جان تھی۔ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ سپاہی اس کی خوابگاہ میں روشنک اور اس کے بچے کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ آخر انہیں پلنگ کے نیچے چور دروازہ مل گیا، کتنے ہی سپاہی اس چور دروازے سے گزر کر جانے لگے۔ کیسنڈر غصے سے کہہ رہا تھا۔ "یہ زہریلی لومڑی بہت ہی مکار ہے۔ اس نے ہمیں باتوں میں لگا کر بہو اور پوتے کو بھگا دیا ہے۔"

وہ غصے سے ٹہلنے لگا۔ کافی انتظار کرنے کے بعد سپاہی روشنک اور اس کے بیٹے کو پکڑ کر لے آئے۔ کیسنڈر کے حکم سے ان ماں بیٹے کو رسیوں سے باندھ کر ایک بھرے ہوئے حوض کے اوپر لٹکایا گیا اور نیم جان اولمپیاس کو حوض کے کنارے لا کر ڈالا گیا۔ کیسنڈر نے اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ "دیکھ... یہ تیرے شیطانی اعمال کا انجام ہے، تُو نے صرف میرے باپ کو ہی نہیں' اپنی سوکنوں کو اور اپنے شوہر کو بھی ہلاک کرایا۔ آج اپنے بیٹے سکندر اعظم کی پوری نسل کو نیست و نابود ہوتے دیکھ...."

کیسنڈر کے حکم سے ان ماں بیٹے کو پانی میں کبھی ڈبویا گیا' کبھی ابھارا گیا۔ وہ حوض کے کنارے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ڈوبتی ابھرتی سانسوں کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ اپنے ناقابلِ شکست بیٹے کی نسل کو فنا ہوتے نہ دیکھ سکی۔ حوض کے کنارے سے لڑھک کر پانی میں چلی گئی۔ پھر وہاں سے ابھر نہ سکی۔ اس کی بہو اور پوتے کو بھی اسی طرح ڈبو ڈبو کر' تڑپا تڑپا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

یہ اس فاتح سکندر اعظم کی ماں' بیوی اور اکلوتے بیٹے کا انجام تھا، جو ساری دنیا کو فتح کر لینا چاہتا تھا۔ مشرقی ایشیا تک زمینوں پر قبضہ کرنے والے کے خاندان کے تمام افراد کو ایک گز زمین بھی نہ مل سکی۔ سب ہی کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کر دیا گیا۔

یہ پرانی کہاوت ہے۔ مگر عبرتناک ہے کہ بہت کچھ حاصل کرنے والے اپنے ساتھ ایک تنکا بھی نہیں لے جاتے۔ خالی ہاتھ آنا ہے اور خالی ہاتھ جانا ہے....

(تمت بالخیر)